قوموں کی اصلاح نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر نہیں ہوسکتی

ایڈیٹر
محمد الیاس منیر

ماہ ستمبر 1980

ایل ڈی اے سے منظور شدہ
الحمرا ٹاؤن
محلِّ وقوع
یونیورسٹی نیوکیمپس سے صرف ۲½ میل کے فاصلے پر۔
پلاننگ
جدید ترین تکنیک سے آراستہ و مغربی طرز رہائش کے معیار کے مطابق
بینک
مُسلم کمرشل بنک۔ وحدت روڈ۔ لاہور
نقشہ
مُلحقہ آبادی
وحدت کالونی
اقبال ٹاؤن
ملتان روڈ
وحدت روڈ
یونیورسٹی کیمپس
گارڈن ٹاؤن
فیصل ٹاؤن
سمن برگ
سمن زار
رحمان آباد
ٹاؤن شپ
الحمرا ٹاؤن
خصُوصیّات
جدید ٹرانسپورٹ کا انتظام
تعلیمی و طبی سہولت کے لئے سکول و ہسپتال
سرسبز و شاداب علاقہ
تفریح کے لئے پارک
وسیع و عریض شاپنگ مرکز
بجلی، پانی و سیوریج کا جدید ترین انتظام
مسجد
مہذّب ماحول
کشادہ سڑکیں
بیرونِ ممالک میں مقیم پاکستانیوں کے لئے مخصوص پلاٹ
پراسپکٹس دفتر سے مُفت حاصل کیجئے۔
اوقاتِ رابطہ:- صبح ۸ بجے تا ایک بجے دوپہر — ۳ بجے دوپہر تا ۸ بجے رات — فون نمبر ۸۵۳۱۰۲
اٹلس انٹرنیشنل
فیض روڈ۔ مسلم ٹاؤن۔ لاہور
ڈویلپمنٹ کا آغاز کردیا گیا ہے
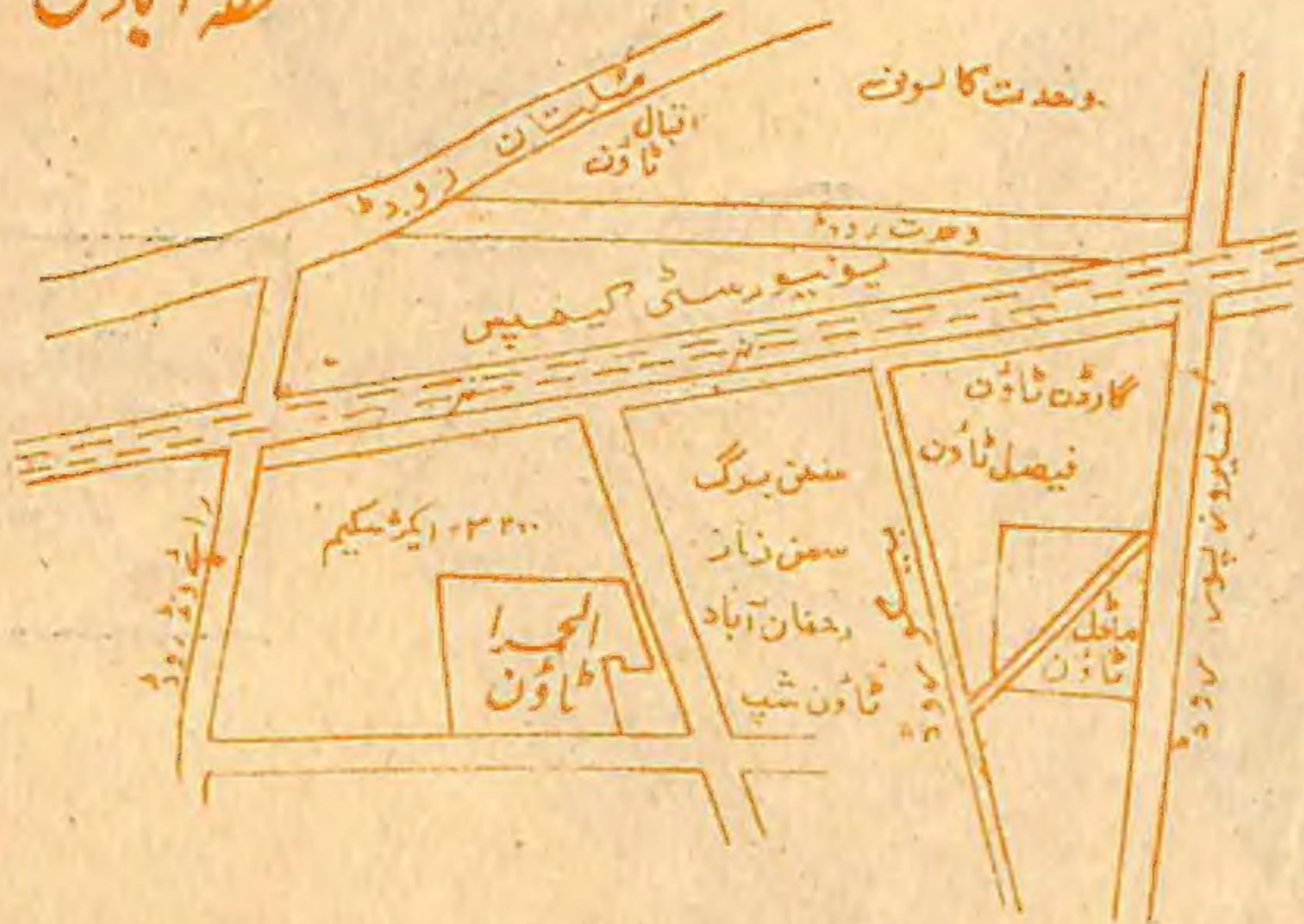
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اِسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ

"تیری عاجزانہ راہیں اس کو پسند آئیں۔"

"قوموں کی اصلاح نوجوانوں کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی۔"

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ کا ترجمان

ماہنامہ —— ربوہ

خالد

جلد ۲۷ - شمارہ ۱۱

تبوک ۱۳۵۹ ہش

ستمبر ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر: محمد الیاس منیر

نائبین: اخلاق احمد انجم۔ اظہر احمد

تزئین و ترتیب: منصور احمد عارف

پبلشر: مبارک احمد خالد۔ پرنٹر: سید عبدالحی

مطبع: ضیاء الاسلام پریس ربوہ

مقام اشاعت: دفتر ماہنامہ خالد دارالصدر جنوبی ربوہ

ترتیب

قیمت سالانہ : ..

قیمت ماہوار :

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

تم نے یہ قتل کیوں کیا؟

...... اور جونہی اسامہ کی تلوار فضا میں لہرائی۔ مدِ مقابل کافر نے فوراً کلمہ پڑھ لیا۔ مگر تلوار اپنا کام کر گئی ــــ جب حضرت اسامہؓ دربار رسالت میں پہنچے تو استفسار ہوا ــــ

"اسامہ! تم نے یہ قتل کیوں کیا؟"

"یا رسول اللہ! اس نے بہت سے مسلمانوں کو زخمی کیا اور بعض تو اس کے ہاتھوں شہید بھی ہو گئے"۔

"مگر اس نے تو لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا تھا"۔ رسول اللہؐ کا لہجہ قدرے سخت تھا۔ "حضور! اس نے کلمہ محض تلوار سے بچنے کیلئے پڑھا تھا"۔ اسامہ کا لجاجت بھرا جواب سن کر سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ناراضگی سے فرمایا ــــ "کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟"

حضرت اسامہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ بار بار دہرایا اور اس فعل پر اس قدر سرزنش فرمائی کہ مجھے رہ رہ کر خیال آتا کاش میں اس دن سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا مورد نہ بنتا ــــ یعنی وہ شخص کلمہ پڑھنے کے بعد حصارِ اسلام میں داخل ہو چکا تھا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی منصف مزاج طبع کو یہ گوارا نہ ہوا کہ آپ کے قریبی اور محبوب ترین صحابی ــــ اسامہ بھی اسے گزند پہنچائیں۔ اگرچہ اس کے اس اظہار اور کلمہ پڑھنے میں شبہ ہی تھا ــــ یہ اس لئے کہ کلمہ طیبہ اسے جان کی امان دے چکا تھا ــــ جان کی امان ہی نہیں بلکہ رسول اللہؐ نے تو کلمہ پڑھنے والے کو جنت کی نوید دی ہے ــــ لیکن دوستو! زبانی اقرار کے ساتھ ساتھ حقیقی اسلام "عمل" کا بھی متقاضی ہے۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ــــ

"جو شخص ہماری طرح کی نماز پڑھتا ہے، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرتا ہے اور ہمارا ذبیحہ کھاتا ہے وہ ایسا مسلمان ہے جسے اللہ اور رسول کی امان حاصل ہے۔ پس اے مسلمانو! اللہ کی اس ذمہ داری میں کوتاہی نہ کرنا"۔

اے خدائے برتر! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہمیں عمل صالح کی توفیق دے تا ہم تیری اس امان میں داخل ہونے والے ہوں جس سے بڑھ کر کوئی امان نہیں ہے ــــ آمین۔

درس

وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

ترجمہ:۔ (اس کے علاوہ ہم یہ بھی قسم کھاتے ہیں کہ) تو (اپنی تعلیم اور عمل میں) نہایت اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر قائم ہے۔

(حدیث)

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ، كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ النَّاسِ خُلُقًا۔

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں میں بہترین اخلاق کے مالک تھے۔

(ملفوظات)

"کیونکہ خدا تعالیٰ نے بے شمار خزائن کے دروازے آنحضرتؐ پر کھول دیئے۔ سو آنجناب نے ان سب کو خدا کی راہ میں خرچ کیا اور کسی نوع کی تن پروری میں ایک حبہ بھی خرچ نہ ہوا۔ نہ کوئی عمارت بنائی نہ کوئی بارگاہ تیار ہوئی۔ بلکہ ایک چھوٹے سے کچے کوٹھے میں جس کو غریب لوگوں کے کوٹھوں پر کچھ بھی ترجیح نہ تھی۔ اپنی ساری عمر بسر کی بدی کرنے والوں سے نیکی کر کے دکھلائے اور وہ جو دل آزار تھے ان کو ان کی مصیبت کے وقت اپنے مال سے خوشی پہنچائی۔ سونے کے لئے اکثر زمین پر بستر اور رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا جھونپڑا اور کھانے کے لئے نان جو یا فاقہ اختیار کیا۔ دنیا کی دولتیں بکثرت ان کو دی گئیں پر آنحضرتؐ نے اپنے پاک ہاتھوں کو دنیا سے ذرا آلودہ نہ کیا اور ہمیشہ فقر کو تونگری پر اور مسکینی کو امیری پر اختیار رکھا۔"

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۶۰، ۲۶۱ حاشیہ)

تاریخی پس منظر

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

(جناب عبدالسمیع خان ــــــ ربوہ)

جس نور سے معمورۂ عالم ہے منور ٭ اس نور کی اک شمع فروزاں دیکھ
العظمۃ للّٰہ کی تفسیر ہے ہر دل ٭ ربوہ کی فضاؤں میں وہ گونج اذاں دیکھ

آج سے ۳۳ سال قبل اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان دولخت ہو گیا۔ اور مملکتِ خداداد پاکستان معرضِ وجود میں آئی۔ تقسیمِ ہند کا یہ واقعہ بہت سی تلخ و شیریں یادیں لئے ہوئے ہے۔

اس تقسیم کے بعد جماعت احمدیہ کے امام وقت مرزا بشیر الدین محمود احمد نے قادیان سے پاکستان ہجرت کا فیصلہ فرمایا۔ اور اس طرح تاریخِ احمدیت کا ایک انوکھا باب صفحۂ دہر پر رقم ہونے لگا۔ لیکن چرخِ کہن نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ایک باغ کا باغ، ایک چمن کا چمن ایک جگہ سے اکھیڑ کر دوسری جگہ لگا دیا گیا۔ اور وہ باغ پھر سے لہلہانے لگا۔ اور ایک عالم کو محوِ حیرت کر گیا۔

اس ہجرت سے ۵۳ برس قبل ۱۸ ستمبر ۱۸۹۴ء کو "داغ ہجرت" بانیٔ جماعتِ احمدیہ کو الہام ہوا تھا۔ جس میں ہجرت کی واضح خبر دی گئی تھی۔ اور ہجرت کے ساتھ "داغ" کا پُر حکمت لفظ رکھ کر اس طرف اشارہ فرمایا تھا کہ ہجرت نہایت خوفناک، پُر آشوب اور تکلیف دہ حالات میں ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ایسا ہی وقوع میں آیا۔

اس ہجرت کا پس منظر یوں ہے کہ گورداسپور کا علاقہ جس میں قادیان کی بستی بھی واقع ہے تقسیمِ ہند کے وقت ۳ جون ۱۹۴۷ء کے اعلان کے مطابق پاکستان کا حصہ قرار دیا گیا لیکن بعد میں نہاں در نہاں مصلحتوں کے تحت اس فیصلہ کو بدل دیا گیا۔ ریڈکلف ایوارڈ میں ۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو نہایت ظالمانہ طور پر بٹالہ، گورداسپور اور پٹھانکوٹ کی تحصیلیں ہندوستان کا حصہ قرار دے دی گئیں تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح قادیان کے ماحول میں بھی فسادات، قتل و غارت، اغوا اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ آپ نے فوری طور پر خداداد بصیرت اور حیرت انگیز فراست و ذہانت سے ان تشویشناک حالات کے ہولناک

نتائج پر غور فرمایا اور سب سے پہلے جماعت
کا مرکزی خزانہ بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان منتقل
کرادیا ۔ پھر ۲۵ اگست ۱۹۴۷ء کو حضور کے
ارشاد پر حضرت اماں جانؓ اور دوسری خواتینِ
مبارکہ لاہور تشریف لے آئیں ۔ بالآخر جب خطرہ
براہِ راست قادیان کی آبادی پر منڈلانے لگا اور
حالات لمحظ بلحظ بگڑتے چلے گئے تو جماعت
کے مشورہ سے پاکستان
آنے کا فیصلہ فرمایا گیا

حضورؓ نے حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد
صاحب کو اپنے بعد امیر مقامی مقرر فرمایا ۔ اپنی
روانگی سے ایک روز قبل ۳۰ اگست ۱۹۴۷ء
کو جماعت ہائے احمدیہ ضلع گورداسپور کے نام
الوداعی پیغام رقم فرمایا اور اگلے روز آپ
سوا ایک بجے حضرت نواب محمد علیخان صاحبؓ
کی کوٹھی "دارالسلام" قادیان سے مکرم کیپٹن
ملک عطاء اللہ صاحب کی موٹر کے ذریعہ روانہ ہو
کر ۴½ بجے شام بخیریت مکرم شیخ بشیر احمد صاحب
مرحومؓ ایڈووکیٹ جماعت احمدیہ لاہور کی کوٹھی
واقع ۱۳ ٹمپل روڈ میں پہنچ گئے ۔

اس سے قبل جماعت احمدیہ لاہور نے حضور
اور احباب جماعت کے قیام کے لئے میو ہسپتال
کے قریب چار کوٹھیوں کا انتظام کر لیا تھا جن کے
ہندو مالک بھارت جا چکے تھے ۔ چنانچہ
آپ اور آپ کے خاندان
کی رہائش کے لئے رتن باغ
تجویز کیا گیا ۔ دفاتر اور کارکنوں کے قیام
کے لئے جودھامل بلڈنگ اور دیگر احباب کیلئے
جسونت بلڈنگ اور سیمنٹ بلڈنگ کو موزوں
سمجھا گیا ۔

آپ نے لاہور پہنچنے کے ایک روز بعد
یکم ستمبر کو جودھامل بلڈنگ میں صدر انجمن احمدیہ
پاکستان کی بنیاد رکھی اور حضرت نواب محمد عبداللہ
خان صاحبؓ کو ناظر اعلیٰ مقرر فرمایا
اور ریڈیو پاکستان اور ملکی پریس میں یہ اعلان
بھجوا دیا گیا ۔

۳ ستمبر کو حضرت مرزا عزیز احمد صاحبؓ
نائب ناظر اعلیٰ قادیان نے امیر مقامی حضرت
مرزا بشیر احمد صاحب کی خصوصی ہدایت پر
"لوائے احمدیت" کا صندوق پاکستان بھجوادیا
یہ یادگار صندوق مکرم مرزا عبدالغنی صاحب
محاسب صدر انجمن احمدیہ لائے تھے

۵ ستمبر کو آپ نے پاکستان میں پہلا
خطبہ جمعہ مسجد احمدیہ دہلی دروازہ لاہور میں ارشاد
فرمایا ۔ اور احمدیت کے مستقبل سے متعلق یہ پُرشوکت
پیشگوئی فرمائی ۔

"خدا نے اپنے ہاتھ سے ہماری جماعت
کو قائم کیا ہے خدا اپنے لگائے ہوئے
پودے کو دشمن کے ہاتھ سے کبھی تباہ
نہیں ہونے دے گا ۔ خدا محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا اس ملک میں کبھی نیچا نہیں ہونے دے گا۔ خدا قرآن کو اس ملک میں کبھی ذلیل نہیں ہونے دے گا۔ وہ ضرور ان کو پھر عزت بخشے گا۔ اور ان کو فتح وکامرانی عطا کرے گا۔"

دفاتر صدر انجمن احمدیہ پاکستان کے ساتھ ہی رتن باغ کے ایک حصہ میں لنگرخانہ کھول دیا گیا اور مکرم ملک سیف الرحمٰن صاحب کو ناظر ضیافت مقرر فرمایا۔

جماعت احمدیہ کی تنظیم نو سے متعلق آپ پروگرام کی تفصیلات طے کرنے کے لئے حضور نے ۷ ستمبر کو نمائندگانِ جماعت کی فوری مشاورت طلب فرمائی۔ یہ مشاورت رتن باغ کے کمرہ نماز میں منعقد ہوئی۔ اس میں ڈیڑھ صد نمائندگان نے شمولیت کی۔ حضور نے ان سے قریباً پانچ گھنٹے تک خطاب فرمایا۔ اس مجلس میں مرکز پاکستان اور حفاظت قادیان سمیت چھ اہم فیصلے کئے گئے۔

احمدی جماعتوں کو قادیان کے حالات سے باخبر رکھنے کے لئے مکرم شیخ بشیر احمد صاحب امیر جماعت احمدیہ لاہور نے روزانہ شام کے سوا آٹھ بجے ریڈیو سے قادیان کی خبریں نشر کرنی شروع کیں۔

پھر صدر انجمن احمدیہ پاکستان کی طرف سے جماعتوں کے نام روزانہ مختصر بلیٹن شائع کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ بیرونِ ملک جماعتوں کیلئے حضور کے ارشاد پر روزانہ انگلستان مشن کو بذریعہ ہوائی ڈاک اطلاعات پہنچائی جانے لگیں۔

اور ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مکرم شیخ روشن دین صاحب تنویر مرحوم کی ادارت میں لاہور سے اخبار "الفضل" باقاعدہ جاری کر دیا گیا۔

۷ ستمبر کی مجلس مشاورت کے فیصلہ کے مطابق حضور نے پہلے تو انفرادی طور پر پاکستان کے احمدیوں کو قادیان جانے اور عورتوں اور بچوں کو وہاں سے لانے کی تلقین کی پھر ۱۲ ستمبر کو اس کام کیلئے کم از کم دو سو ٹرکوں کی تحریک فرمائی۔ جس کی تعمیل میں لاہور سے قادیان جانے والے فوجی ٹرکوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ اور آبادی کے انخلا کا یہ سلسلہ قریباً ۲ ماہ جاری رہا آخری کنوائے ۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو آیا اس تمام عرصہ میں حضور ۲۵ روپے روزانہ صدقہ دیتے رہے۔ اور آخری قافلے کے بعد سو روپے ماہوار صدقہ دیتے رہے۔

حضور نے وسط نومبر ۱۹۴۷ء میں مکرم مولوی عبدالرحمٰن صاحب انور انچارج تحریک جدید کو قادیان سے بلوایا اور انہوں نے تحریک جدید کا کام لاہور میں شروع کر دیا۔ یہ ادارہ ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو رجسٹرڈ ہوا۔

ان حالات میں پیارے آقا نے ایک نئے مرکز کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ فرماتے ہیں:۔

"میں نے پورے طور پر محسوس کیا کہ
میرے سامنے ایک درخت کو اکھیڑ
کر دوسری جگہ لگانا نہیں بلکہ ایک
باغ کو اکھیڑ کر دوسری جگہ لگانا ہے
یعنی ہمیں اس بات کی اشد ضرورت
ہے کہ فوراً ایک مرکز بنا یا جائے۔"

آپ کے ارشاد پر نئے مرکز کے لئے موزوں جگہ کی تلاش شروع کر دی گئی۔ کئی مقامات تجویز کئے گئے۔ بالآخر مکرم چوہدری عزیز احمد صاحب سیشن جج سرگودھا کی تجویز پر چک ڈھگیاں کی اراضی (موجودہ ربوہ) مرکز نو کے لیے منظور کی گئی۔ ۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آپ نے اس جگہ کا بنفس نفیس معائنہ فرمایا۔

یہ زمین خریدنے کے لئے ۱۸ر اکتوبر کو ناظر اعلیٰ صدر انجمن کی طرف سے مکرم منشی محمد دین صاحب نے ڈپٹی کمشنر جھنگ مکرم چوہدری مشتاق احمد صاحب چیمہ کی خدمت میں درخواست پیش کر دی اور ۱۱ر جون ۱۹۴۸ء کو حکومت پنجاب نے اس کی منظوری دے دی۔ اور ۵ر اگست ۱۹۴۸ء کو صدر انجمن احمدیہ نے حکومت پاکستان سے زمین کا قبضہ لے لیا۔

یہ زمین جو تحصیل چنیوٹ کے چک ڈھگیاں کی ۱۰۳۴ ایکڑ اراضی پر مشتمل ہے ایک شاندار تاریخی پس منظر کی حامل ہے۔ یہ وہی سرزمین ہے جہاں سے محمد بن قاسم نے سندھ اور ملتان کی فتح کے بعد اپنے لشکر جرار سمیت دریائے چناب کو عبور کر کے کشمیر کی طرف پیشقدمی کی تھی۔ اس موقعہ پر عرب فوج اور چنیوٹ کے ہندو راجہ کی خونریز جنگ ہوئی اور چنیوٹ کو فتح کرتے ہوئے تقریباً ۱۰۰ مجاہدین نے جام شہادت نوش کیا تھا چنانچہ آج تک اس سرزمین میں شہیدوں کا قبرستان موجود ہے جو موجودہ بہشتی مقبرہ سے ملحق پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔

صدر انجمن احمدیہ نے ۱۹ر جون ۱۹۴۸ء کو دس ممبران پر مشتمل تعمیر کمیٹی تشکیل دی جس کے صدر حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ تھے۔ ربوہ کی آبادی کے سلسلہ میں حضور کے ارشاد پر سب سے پہلے تعلیم الاسلام ہائی سکول چنیوٹ میں کھولا گیا۔ پھر جامعہ احمدیہ بھی چنیوٹ آگیا۔ مگر فروری ۱۹۴۸ء میں اسے احمد نگر منتقل کر دیا گیا۔ جون ۱۹۴۸ء میں حضور کے ارشاد پر قادیان کی لائبریری کی کتب چنیوٹ منتقل کر دی گئیں۔ اس وجہ سے چنیوٹ اور احمد نگر کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی۔

اکتوبر ۱۹۴۸ء کے آخر تک ۵۳۹ احباب نے اس وادی بے آب وگیاہ میں رہائش کے لئے اپنی رقوم پیش کیں ان میں پہلا نام حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحبؓ کا اور دوسرا حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکیؓ کا تھا۔

آپ نے افتتاح مرکز کے لئے ۲۰ ستمبر کا دن مقرر فرمایا۔ عہدیداران صدر انجمن احمدیہ اور

تحریک جدید کے ایک اجلاس میں نئے مرکز کا نام زیرِ غور لایا گیا۔ ماویٰ۔ ذکریٰ۔ دار الہجرت، مدینۃ المسیح اور ربوہ وغیرہ نام پیش ہوئے۔ حضور نے حضرت مولانا جلال الدین صاحب شمسؓ کی طرف سے پیش کردہ نام "ربوہ" منظور فرمایا۔

ربوہ کے افتتاح کے سلسلہ میں خیموں اور چھولداریوں کو نصب کرنے اور دیگر ضروری انتظامات کے لئے چھ افراد پر مشتمل پہلا قافلہ ۱۹ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو لاہور سے ربوہ روانہ ہوا۔ محترم عبد السلام اختر مرحوم کی امارت میں یہ قافلہ شام ۷ بجے سرزمین ربوہ پہنچا۔ عبد السلام اختر صاحب اور مولوی محمد صدیق صاحب انچارج خلافت لائبریری نے پہلا خیمہ نصب کیا اور پھر مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا کیں۔ بعد میں لاہور سے آنے والے کارکنوں نے مل کر وسیع و عریض شامیانہ اور ۶ رہائشی خیمے نصب کئے۔

۲۰ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو حضور نے نو بج کر بیس منٹ پر لاہور سے روانہ ہو کر ایک بج کر بیس منٹ پر ربوہ کی سرزمین میں ورود فرمایا۔ ڈیڑھ بجے حضور نے نماز ظہر پڑھائی جس میں اڑھائی صد احباب شامل ہوئے۔ یہ پہلی باجماعت نماز تھی جو حضور کی اقتداء میں اس سرزمین پر ادا کی گئی۔ بعد میں اسی جگہ یادگاری مسجد تعمیر کی گئی جو فضل عمر ہسپتال کے قطعہ میں ہے۔

نماز ظہر کے بعد حضور نے افتتاحی خطاب شروع فرمایا اور آغاز میں بلند آواز سے وہ دعائیں پڑھیں جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت مانگی تھیں۔ تمام دوست یہ دعائیں حضور کے ساتھ دہرا تے گئے۔ پھر خطاب کرتے ہوئے ربوہ کا مقصد بیان کیا۔

"ہم نے اس وادیٔ غیر ذی زرع کو
جس میں فصل اور سبزیاں نہیں ہوتیں
اس لئے چنا ہے کہ ہم یہاں بسیں
اور اللہ تعالیٰ کے نام کو بلند کریں"۔

ایک مؤثر اور درد بھرے خطاب کے بعد حضور نے ایک لمبی دعا کرائی۔ عین اسی وقت درویشان قادیان بھی دعا میں مشغول ہو گئے۔ وقت کی اطلاع انہیں پہلے سے دے دی گئی تھی۔

دعا کے بعد حضور نے رقبہ کے وسط میں ایک بکرا اپنے دستِ مبارک سے ذبح کیا۔ اور پھر چاروں کونوں پر مندرجہ ذیل اصحاب نے چار جانور ذبح کئے۔

(۱) حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب دردؓ۔
(۲) حضرت مولوی محمد عبد اللہ صاحب بوتالویؓ
(۳) مکرم چوہدری برکت علی خان صاحبؓ اور
(۴) مکرم مولوی محمد صدیق صاحب انچارج خلافت لائبریری۔

قربانیوں کے بعد ایک ترک نوجوان محمد فضلی

نے حضور کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور یہ خوش قسمت نوجوان نئے مرکز کا پہلا بچہ قرار دیا گیا۔ جناب افضل آج کل لندن میں مقیم ہیں۔

پھر حضورؓ نے نماز پڑھائی اور چنیوٹ کے احمدیوں کی طرف سے ایک دعوتِ طعام میں شرکت فرمائی۔

پھر چار بج کر چالیس منٹ پر لاہور واپس تشریف لے گئے اور یوں نئے مرکز احمدیت کی افتتاحی تقریب بخیر و خوبی مکمل ہوئی۔

سرزمینِ ربوہ جو پہاڑی ٹیلوں کے درمیان مرکزِ احمدیت کے لئے منتخب کی گئی۔ اس کے متعلق دسمبر ۱۹۴۱ء میں رؤیا مبارکہ دیکھی تھی اور اسی کے مطابق یہ زمین خریدی گئی۔

حضور نے اس رؤیا میں دیکھا کہ قادیان پر حملہ ہوا اور آپ اور آپ کے اصحاب کو قادیان سے نکلنا پڑا اس کے بعد ایک آدمی نے رہائش کے لئے آپ کو ایک جگہ بتائی جس کے گرد پہاڑی ٹیلے تھے۔ اور ایک خوبصورت مسجد بھی تھی آپ نے اسے رؤیا میں ہی پسند فرمایا اور کہا کہ اب ہم اسی جگہ رہیں گے۔

ربوہ کے معنی بلند مقام یا پہاڑی کے ہیں آپ فرماتے ہیں کہ

"یہ نام اس نیک نامی کے طور پر تجویز کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اس مرکز کو خود صداقت اور روحانیت

> "کہا جاتا ہے کہ خلیفہ کا کام صرف نماز پڑھا دینا اور بیعت لے لینا ہے۔ یہ کام تو ایک مُلّاں بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لئے کسی خلیفہ کی ضرورت نہیں۔ اور میں اس قسم کی بیعت پر تھوکتا بھی نہیں بیعت وہ ہے جس میں کامل اطاعت کی جائے اور خلیفہ کے کسی ایک حکم سے بھی انحراف نہ کیا جائے"
>
> (خطباتِ نور)

کی بلندیوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے، اور وہ خدائی نور کا ایک ایسا بلند مینار ثابت ہو جسے دیکھ کر لوگ اپنے خدا کی طرف راہ پائیں۔ اس کے علاوہ ظاہری لحاظ سے بھی یہ جگہ ایک ربوہ کا حکم رکھتی ہے کیونکہ وہ اردگرد کے علاقہ سے اونچی ہے۔ اور اس کے ساتھ بعض چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی ہیں۔ گویا ایک پہلو میں چناب کا دریا ہے جو پانی یعنی ذریعہ حیات کا منظر پیش کرتا ہے اور دوسرے پہلو میں بعض پہاڑیاں ہیں جو بلندی کی علامت کی علمبردار ہیں"

([illegible])

ربوہ کے قیام میں حضرت نواب محمد دین صاحب نے بہت سی خدمات انجام دیں چنانچہ حضور فرماتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے جدید مرکز کے قیام کا سہرا یقیناً نواب محمد دین صاحب مرحوم رضی کے سر ہے۔ اور یہ عزت اور رتبہ انہی کا حق ہے۔ جب تک یہ جماعت قائم رہے گی لوگ ان کے لئے دعا بھی کریں گے۔ اور یقیناً اس مقام سے تعلق رکھنے کی وجہ سے نواب صاحب مرحوم کا نام بھی قیامت تک قائم رہے گا۔"

(الفضل ۳۱ جولائی ۱۹۴۹ء)

ربوہ ذات قرار و معین

ربوہ کا بے آب و گیاہ میدان اور چٹیل زمین جو دیو ہیکل خشک پہاڑیوں سے گھری ہوئی تھی جو گیدڑوں اور بھیڑیوں کا مسکن تھی جب دنیا کی نظروں نے ناکارہ سمجھ کر رد کر دیا تھا خدا کے خلیفہ کی نظر گاہ بنی۔ وہ کیا ہی نیک گھڑی ہوگی جب اس دشت کو "ربوہ ذات قرار و معین" بنانے کا فیصلہ ہو رہا تھا شیخ طریقت کے ماہ منور نے اس کی خاک پر اپنے قدموں سے ضیاباری کی ہے اور اب تعلیم تفقہ کا صاحب قرآن اس میں جلوہ فرما ہے۔ جس کی روح کی تڑپ، جس کے دل کا گداز اور جس کی آنکھوں کے نور سے اس کائنات کے ظلماتی پردے چاک ہو کر توحید کا پرچم بلند سے بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

دلِ کے داغ

غم کے عالم میں بھی اب تو مسکرا لیتا ہوں میں
داغ سینے کے زمانے سے چھپا لیتا ہوں میں

آگیا ہے مشکلیں آسان کر لینا مجھے
دل کے کچھ ارمان دل میں ہی دبا لیتا ہوں میں

راہِ اُلفت میں جو منزل سے بھٹک جاؤں کبھی
موجِ دریا کی طرح ساحل کو پا لیتا ہوں میں

کوئی صورت جب نظر آئے نہ درماں کی مجھے
لے بھی ہیں درد کو درماں بنا لیتا ہوں میں

گاہے گاہے عشق کی خودداریوں کے باوجود
دیکھ کر دستِ کرم دامن بڑھا لیتا ہوں میں

توڑنی پڑتی ہے اکثر ترکِ اُلفت کی قسم
بے خودی میں پھر انہیں سے دل لگا لیتا ہوں میں

صدق سوز و [illegible] میں ڈوبے ہوئے اشعار میں
اپنے حالِ زار پر آنسو بہا لیتا ہوں میں

(محمد صدیق امرتسری ربوہ)

دلی کا ایک گمنام ادیب اور شاعر

جناب مسعود احمد خان دہلوی

میں دلی کے ایک گمنام ادیب شہیر کا تعارف کرانے کی غرض سے محفل خالد میں حاضر ہوا ہوں

آپ کہیں گے چہ خوب! بسم اللہ ہی غلط۔ پہلا فقرہ ہی تضاد کا حامل۔ ایک ہی سانس میں دو باتیں اور ایک دوسری سے الٹ۔ اسی کو کہتے ہیں یک بام و دو ہوا۔ واہ وا واہ۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ادیب گمنام بھی ہو اور شہیر بھی؟ جی ہاں ایسا ممکن ہے۔ کم از کم جس ادیب کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ یقیناً گمنام بھی تھا اور شہیر بھی۔ گمنام اس لئے کہ اس نے ایک بلند پایہ ادیب ہونے کے باوجود از خود گمنامی اختیار کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنوں اور غیروں کی نظر میں ایک ادیب کی حیثیت سے مشہور ہو۔ وہ سادہ منش، درویش صفت، اسلام کا شیدائی اور حق کا فدائی یہی چاہتا تھا کہ وہ احمدیت کے ایک ادنیٰ ترین خادم کی حیثیت سے دنیا میں جانا پہچانا جائے۔ اس نے ہمیشہ خدمتِ اسلام اور خدمتِ سلسلہ کو مقدم رکھا اور اپنی ادبی حیثیت کو گمنامی کی حد تک مؤخر۔

قدرت نے اُسے قلم و زبان کے ذریعہ نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں اظہارِ خیال کی عجیب و غریب صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ گویا ہوتا تو، جاننے والے جانتے ہیں، مجلس پر چھا جاتا۔ رقمطراز ہوتا تو صفحۂ قرطاس پر نثرِ پُر اثر میں الفاظ کے موتی جَڑ کر رکھ دیتا۔ سننے والے سر دھنتے اور پڑھنے والے عش عش کر اُٹھتے۔ لیکن قلم و زبان کی یہ سب صلاحیتیں اُس نے خدمتِ اسلام اور خدمتِ سلسلہ کے لئے وقف کر رکھی تھیں۔ پھر دنیا اُس کے ادبی شہ پاروں سے روشناس ہوتی تو کیونکر ہوتی اور اسے ادیبوں میں شمار کرتی تو کس طرح کرتی۔ ادب کے لحاظ سے عوام کی نگاہ میں وہ ہمیشہ گوشۂ خمول ہی میں رہا: اور یہ

امر بھی اس کے لئے اطمینانِ قلب اور تسکینِ روح کا باعث تھا۔

چنانچہ اس گمنامی کے نتیجہ میں اُسے قلم و زبان سے خدمتِ اسلام اور خدمتِ سلسلہ کی توفیق ملی اور خوب ملی۔ خلافتِ ثانیہ کے اوائل میں اس نے خلافتِ حقہ کے حق اور منکرینِ خلافت کی مخالفت میں زور دار مضامین لکھے اور دینی نظمیں کہہ کہہ کر جلسوں میں پڑھیں جو اس وقت بے انتہا مقبول ہو کر زبان زدِ عام ہوئیں۔ اسی طرح اہم دینی موضوعات پر دل موہ لینے والی تقاریر کے علاوہ آریوں، سناتنیوں، عیسائیوں، دہریوں، غیر احمدیوں اور پیغامیوں سے مقابلے کامیاب مناظرے کئے۔ دلی اور یوپی میں کسی بھی مخالف کو اس کے سامنے دَم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ بالآخر اُس کی یہ تمنا پوری ہوئی کہ وہ ادنیٰ ترین خادمِ احمدیت کے طور پہ جانا اور پہچانا جائے۔ اور وہ اس طرح کہ جب ۱۹۵۵ء میں اس کی وفات ہوئی تو اس کے جان و دل سے عزیز [illegible] نے اس کی وفات پر ایک معرکہ آرا خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ جب آنے والی نسلیں میرا یہ خطبہ پڑھیں گی سلسلہ کے اس خادم کی تعریف کئے بغیر نہ رہیں گی اور اسی خطبہ کے ذریعہ اس کا نام اس کے بعد بھی زندہ رہے گا اس طرح گمنامی کے اس دلدادہ کو دنیا میں بھی حیاتِ جاوداں نصیب ہوئی۔

ہاں گمنام ہونے کے باوجود وہ شہیر بھی تھا۔ اس لئے کہ جب ایک حادثہ کے نتیجہ میں دلی کے جوہر شناس ادیبوں کو اُس کی ادبی صلاحیتوں کا علم ہُوا تو انہوں نے اسے سر آنکھوں پہ بٹھایا، دیدہ و دل کو اس کے لئے فرشِ راہ کیا۔ شمس العلماء "مصورِ فطرت" خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اسے "بلبلِ ہزار داستان" کا لقب دیا اور اپنے ہفت روزہ "منادی" میں ہمیشہ اسی لقب سے اسے یاد فرمایا۔ جب خواجہ صاحب نے دیکھا کہ یہ شخص گوشۂ خمول کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں تو پھر خود اس کے غریب خانہ پہ جا کر اس کے لطائف و ظرائف اور ادبی شہ پاروں سے محظوظ ہوئے۔ ملا واحدی، خواجہ محمد شفیع دہلوی، اشرف صبوحی، پنڈت گوپی ناتھ امن، پنڈت راج نرائن ارمان، طالب بنارسی، عبدالقوی نعمان، حسن عسکری، اور دوسرے نامور ادیب اور شاعر گاہے گاہے اپنے دوستوں کے ہمراہ اس کے غریب خانہ پر حاضر ہوتے اور ان کے اصرار پر اچھی خاصی ادبی محفل جم جاتی۔ وہ اپنے لطائف و ظرائف سے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیتا اور اپنے رشحاتِ قلم سُنا کر ان پہ اہتزاز کی کیفیت طاری کر دیتا۔ دلی کے آخری داستان گو میر باقر علی نے جن کی وفات

کے ساتھ داستان گوئی کا فن ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہو گیا ایک دفعہ اپنی مجلس میں اس گمنام ادیب کی طرف اشارہ کر کے کہا میرے بعد اگر کوئی اس فن کو زندہ رکھ سکتا ہے تو وہ یہ شخص ہے لیکن مجھے افیون نے (یاد رہے میر باقر علی افیون کا نشہ کرتے تھے) کسی کام کا نہیں چھوڑا اور اس کو مذہب لے ڈوبا۔ مذہب کے لے ڈوبنے سے ان کی مراد صرف اتنی تھی کہ اس گمنام ادیب شہیر کے مذہبی شغف کی وجہ سے دُنیا ایک بلند پایۂ داستان گو سے محروم ہو گئی۔ ورنہ مذہب نے اسے وہ چار چاند لگائے کہ اس کا نام ایک خادم دین کی حیثیت سے احمدیت کی تاریخ میں زندہ رہے گا ___

ویسے جہاں تک داستان گوئی میں دسترس کا تعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ کبھی کبھار شاذ کے طور پر وہ دوستوں کے اصرار پر داستان بیان کرنے پر راضی ہو جاتا تو عشاء کے بعد داستان شروع کرتا اور داستان ختم ہوتے ہوتے رات بھی ختم ہو جاتی۔ موقع اور محل کی مناسبت سے اتار چڑھاؤ کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلسل گھنٹوں بولتا چلا جاتا، نہ خود تھکتا اور نہ سُننے والے اکتانے کا نام لیتے۔ میں عینی شاہد ہوں اس دلفریب نظارہ کا کہ داستان سنانے والا جب چاہتا ہنسا ہنسا کر سامعین کے پیٹ میں بل ڈال دیتا۔ دوسرے ہی لمحہ جب کوئی دردناک

"خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ان تمام روحوں کو جو زمین کی متفرق آبادیوں میں آباد ہیں کیا یورپ اور کیا ایشیا۔ اُن سب کو جو نیک فطرت رکھتے ہیں۔ توحید کی طرف کھینچے اور اپنے بندوں کو دین واحد پر جمع کرے۔ یہی خدا تعالیٰ کا مقصد ہے۔ جس کے لئے مَیں دُنیا میں بھیجا گیا۔ سو تم اس مقصد کی پیروی کرو مگر نرمی اور اخلاق اور دُعاؤں پر زور دینے سے۔"

(الوصیّت ص۷)

واقعہ بیان کرتا تو سنگدل سے سنگدل بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہتے۔ اسی طرح قہقہے بلند کرنے اور آنسوؤں کے موتی رولنے میں رات بیت جاتی۔ لطف کی بات یہ کہ لوگ آئندہ پھر سُننے کی تمنا لے کر ہی اُٹھتے۔

یہ ادیب شہیر، یہ نغز گو شاعر، یہ بلند پایۂ داستان گو خاکسار راقم الحروف کے والد محترم بلبلِ ہزار داستان محمد حسن آسان دہلوی تھے وہ زاہدِ شب زندہ دار، زمرۂ اولیاء کے ممتاز فرد، دلّی کے مشہور سجادہ نشین، عالم باعمل حافظ ذبیر محمد خان صاحب اثر شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت مولوی محمود الحسن خان

کے فرزند اکبر طالب علمی کے زمانہ میں اپنے بعض غیر احمدی عزیزوں کے ہمراہ ادیبوں اور شاعروں کی مجلسوں میں بارہا جانے کا اتفاق ہوا۔ اسی طرح بچپن ہی میں ادب کا چسکا لگا اور ایسا لگا کہ ادبی ذوق ترقی کرتا چلا گیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد تو ادب میں شغف کا عالم یہ ہوا کہ ہمہ وقت ادبی کتابوں کے مطالعہ میں ہی مصروف رہنے لگے۔ ان کے والد ماجد ۳۱۳ اصحابِ کبار کے مقدس زمرہ میں شامل، بہت دیندار اور فدائی احمدی تھے ان کی یہ حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے اور اکثر حسرت سے فرمایا کرتے۔ "عنقا آئی بھی تو لنڈوری" — یعنی خدا نے بیٹا دیا اور وہ نکلا تو ایسا کہ اسے دین سے چنداں لگاؤ نہیں۔ ہر وقت ادبی کتابیں ہی پڑھتا رہتا ہے۔ بالآخر ان کی دعائیں قبول ہوئیں۔ اس اٹھتے ہوئے ادیب کی اٹھتی جوانی میں یکایک انقلاب آیا اور وہ ادب سے ناطہ توڑ اور شعر شاعری سے منہ موڑ مذہب کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ سلسلہ کا تمام لٹریچر پڑھ ڈالا۔ نیز دیگر مذاہب کا بھی بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ پھر تو مذہب کا ایسا رنگ چڑھا کہ مذہب ہی اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ وہ اب ایک نامور ادیب، نغز گو شاعر، اور بلند پایہ داستان گو نہیں نہیں، بلکہ اسلام و احمدیت کا ایک نڈر و بیباک مبلغ، فصیح البیان مقرر، نہایت ہی کامیاب مناظر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سلسلہ کا ایک ادنیٰ ترین خادم تھا۔ وہ زندگی بھر یہی کچھ رہا اور نہایت کامیاب زندگی گزار کر اس نے اسی حال میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

مطالعہ کتب

ماہِ ستمبر میں مطالعہ کتب کے سلسلہ میں "توضیح مرام" مقرر ہے خدام بھائیوں سے درخواست ہے کہ اس کا مطالعہ فرمائیں نیز قائدین سے گذارش ہے کہ وہ اس امر کی نگرانی کریں کہ ہر خادم اس کتاب کا مطالعہ کر لے۔ (مہتمم تعلیم)

جمال و حسنِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے
نظیر اس کی نہیں جمتی نظر میں فکر کر دیکھا
بھلا کیونکر نہ ہو یکتا کلامِ پاکِ رحماں ہے

(دُرِّ ثمین)

یادِ رفتگان

۸ مارچ ۱۹۸۰ء کو کار کے حادثہ میں جام شہادت نوش کرنے والے لاہور کے تین مخلص خدام کے مختصر حالاتِ زندگی پیش کئے جا رہے ہیں۔ محترم ظاہر احمد خان مرحوم اور محترم خواجہ اعجاز احمد مرحوم کے حالات ان کے والد صاحبان محترم عبدالاحد خان صاحب روہڑی اور محترم خواجہ محمد اکرم صاحب لاہور نے رقم فرمائے ہیں۔ اور محترم جواد رشید مرحوم کے حالات ان کی ہمشیرہ مکرمہ سیارہ حکمت صاحبہ لاہور کے قلم سے ہدیۂ قارئین ہیں۔ ——— (ادارہ)

ظاہر احمد خان مرحوم

اپنے بیٹے ظاہر احمد مرحوم کی پیدائش سے پہلے میں قادیان گیا جہاں حضرت صاحب اور حضرت مولانا شیر علی صاحبؓ سے دعا کروائی کہ میرے گھر بچہ پیدا ہونے والا ہے۔

ابھی قادیان ہی میں تھا کہ ۵ر اگست ۱۹۴۶ء کو ظاہر احمد اپنے ننھیال آڑھا ضلع مونگیر (بہار) میں پیدا ہوا۔

جب ظاہر ایک سال کا ہوا تو اللہ اکبر کہنے لگا۔ پھر ڈیڑھ سال سے دو سال کی عمر میں اس کی والدہ نے بہت سی دعائیں گود میں ہی سکھا دیں اور جب تین سال کا ہوا تو پوری اذان دے کر نماز پڑھنا شروع کر دی۔

۱۹۴۶ء میں جب بہار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے تو اس کے ماموں روہڑی (سکھر) میں سب بچوں کو لے آئے۔ وہ یہاں سیمنٹ فیکٹری میں ملازم تھے اور میں قادیان چلا گیا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں میں بھی قادیان سے روہڑی آ گیا۔ میں نے آتے ہی اپنے بچوں کو پہلے قرآن شریف پڑھایا۔ ظاہر احمد اس وقت

چوتھی جماعت میں تھا۔ بچپن ہی سے بہت ذہین اور محنتی تھا شروع سے مذہبی معلومات رکھتا تھا اور تبلیغ کا بھی بہت شوق تھا۔ پرائمری میں اس نے سو فیصد نمبر حاصل کئے۔

۱۹۶۲ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ظاہر احمد نے خود محسوس کیا کہ میرے والد کی آمدنی قلیل ہے اور ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ اس لئے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے روہڑی اسکول میں بطور ٹیچر کام شروع کر دیا اور ساتھ ہی اسلامیہ کالج سکھر میں انٹر کامرس میں داخلہ لے لیا۔ اس دوران گھر میں بھی بہت سے شاگرد مفت ٹیوشن پڑھتے رہے۔ انٹر کامرس کرنے کے بعد روہڑی سیمنٹ ورکس میں بطور کلرک ملازم ہو گیا۔ ملازمت کے دوران ہی اسلامیہ کالج سکھر سے بی۔ کام کیا۔ پھر سندھ یونیورسٹی جام شورو حیدر آباد سے ایم۔ کام کا امتحان پاس کیا۔ اس دوران انٹر کامرس اور بی کام کے لڑکوں کو بغیر کسی معاوضہ کے پڑھایا اور جن جن کو پڑھایا سب کے سب امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوئے۔ حتیٰ کہ روہڑی سیمنٹ ورکس کے دفتر کے لوگوں کو بھی پڑھایا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ وہی لوگ دفتر میں سارا دن ظاہر کی محض احمدیت کی وجہ سے برائی کرتے اور شام کو گھر پڑھنے بھی آجاتے۔

جب ظاہر اسکول میں ٹیچر تھا تو اسلامیہ نام کا ایک بہت بڑا ادارہ تعلیم تھا جس کے بہت سے اسکول اور کالج تھے وہاں سے ایک رسالہ نکلتا تھا اس میں انہوں نے مضمون لکھا

"صحابہ کرامؓ کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت"

جب یہ مضمون شائع ہوا تو تمام لوگ حیران ہو گئے۔ کہ ایک میٹرک پاس لڑکا اور اس کی اتنی دینی معلومات۔ بڑے بڑے غیر از جماعت احباب اور علم دوست لوگ ظاہر احمد کی عزت کرنے لگے

تعلیم اور ملازمت کے دوران ظاہر مرحوم نے اپنے افسروں اور ماتحتوں کے درمیان نیکی، پیار، فرمانبرداری اور دیانتداری کی قابلِ تقلید مثال قائم کی اور دوسری طرف احمدیت کی خدمت طالب علمی کے زمانے سے ذوق و شوق کے ساتھ کرتا رہا۔ ہر قسم کے چندے دیتا، خلیفہ وقت کی ہر آواز پہ لبیک کہنے میں کوشاں رہتا۔ ان سے بہت ہی پیار تھا اسی لئے ہمیشہ کہتا کہ خلیفہ وقت مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کی یہی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے انہیں نو عمری میں ہی مختلف جماعتی عہدے سونپے گئے۔

روہڑی سیمنٹ ورکس میں خدام الاحمدیہ کی تنظیم میں بطور قائد اور پھر قائد ضلع سکھر کی حیثیت سے نمایاں خدمات انجام دیں۔

اور دس سال تک قائد ضلع رہا۔ یہ ذمہ داری میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی اسے سونپ دی گئی تھی۔

ظاہر احمد اپنے دفتر میں ترقی بھی کرتا رہا۔ پہلے کلرک سے اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ ہوا اور پھر بعد میں اکاؤنٹنٹ ہو گیا۔ اس کی محنت اور دیانتداری کی وجہ سے ۱۹۷۷ء میں اسے ہیڈ آفس لاہور بلا لیا گیا۔ جہاں جلد ترقی کر کے اسسٹنٹ مینیجر ہو گیا اور حادثہ کی صبح ۸ / مارچ ۱۹۸۰ء کو تو اسے ڈپٹی مینیجر کا گریڈ دیا گیا تھا۔

لاہور ہیڈ آفس میں اکیلا احمدی تھا۔ سب اس کی دیانتداری اور محنت سے مرعوب تھے کوئی اس کی مخالفت نہ کرتا۔ یہاں پھر اس نے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور پی۔ آئی۔ آئی۔ اے یعنی پاکستان انسٹیٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹس میں داخلہ لیا۔ ڈیوٹی سے آنے کے بعد شام کو ۵ سے ۹ بجے تک کالج پڑھنے چلے جانا۔

لاہور آنے پر بھی اس نے دینی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ پہلے ہی سال ناظم اطفال مقرر ہوا۔ اور جلد ہی قائد ضلع لاہور بنا دیا گیا۔ قائد ضلع کا کام بڑی جانفشانی سے انجام دے رہا تھا اور انہیں خدمات کو بجا لاتے ہوئے اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی انا للہ و انا الیہ راجعون۔

ظاہر احمد خان نے مجھ سے کہا کہ لاہور کے خدام اور بالخصوص اور خاص طور پر لاہور کے امیر جماعت مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔

وہ بہت ہی مہمان نواز تھا۔ اگر کوئی بھی سلسلے کا آدمی یا دوسرا غیر از جماعت یا کوئی رشتے دار ان کے ہاں آتا تو اس کی مہمان نوازی کا بہت خیال کرتا۔ صدقہ و خیرات میں بھی ہاتھ لمبا تھا۔ کسی بھی حاجت مند کی ضرورت پورا کرنے کی پوری کوشش کرتا حتیٰ کہ اگر اس کے لئے قرض لینا پڑا تو اس سے بھی دریغ نہ کیا۔

وہ اپنے پیچھے والدین، تین بھائی اور دو بہنوں کے علاوہ سوگوار بیوہ نادرہ بیگم تین لڑکیاں (۱) سارہ ظہیرہ۔ (۲) رضیہ۔ (۳) سرور سلطانہ۔ اور ایک لڑکا طاہر ہمایوں چھوڑ گیا۔

ظاہر احمد خان نے اپنے والدین۔ بہن بھائیوں اور اہل خانہ کی بہت ہی خدمت کی۔ ایک دفعہ اس کے چھوٹے بھائی عبدالمجید کو حادثہ پیش آ گیا جس سے اس کے دماغ میں سخت چوٹیں آئیں اور وہ سب کچھ بھول بیٹھا۔ اس کے علاج میں ہزاروں روپیہ ظاہر نے پانی کی طرح بہا دیا۔ اور بالآخر اس کا چھوٹا بھائی صحت یاب ہو گیا۔

ظاہر احمد نے اپنی دونوں بہنوں کی شادیاں خود اپنے ہاتھوں ذاتی خرچ پر کیں۔ اس نے سب کی خدمت کی لیکن اپنی خدمت

نہیں کرائی جس کا پورے خاندان کو رنج ہے۔
اے کاش ہم بھی اس کی کوئی خدمت کرتے۔

جواد رشید مرحوم

جواد رشید کیا تھا۔ بہار کا ایک پھول۔ جو کھلا ہی تھا کہ مرجھا گیا۔ نیکی کا ایک فرشتہ جو ہمیں درسِ عمل دے گیا۔ جس کی زندگی جس کے اخلاق ایک عملی نمونہ تھے۔ وہ نیکی کا پیکر۔ طہارت و معصومیت کا مجسمہ تھا جس سے محبت و ہمدردی کی جھلک آتی تھی۔ اس کی پیشانی روشن چہرہ پُر نور اور تازہ۔ اور آنکھیں ذہین معصوم اور حساس تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک اداس درد کی جھلک رہتی۔ جو ہر اس انسان کے حصے میں آتا ہے جو دنیا میں ہونے والی ہر برائی پر کڑھتا۔ اور ہر بے انصافی پر تڑپتا ہے۔

جواد ایک مثالی کردار کا مالک نوجوان تھا۔ اس کی زندگی بڑی با اصول اور منظم تھی۔ اس کی شخصیت بڑی دلچسپ۔ پُرکشش۔ متین اور باوقار تھی۔ وہ بڑی متوازن شخصیت کا حامل تھا۔ بچپن ہی سے اس کے آداب و اوصاف جداگانہ تھے۔ تقویٰ۔ نیکی و پرہیزگاری اس کا وطیرہ تھا۔ نہایت عبادت گزار تھا۔ نمازِ تہجد خشوع و خضوع سے ادا کرتا۔ ایک بار رمضان کے آخری عشرہ کے نوافل میں اتنی گریہ زاری کی کہ ہم پریشان ہو گئے۔ ہمارے پوچھنے پر "کہ جواد تمہیں کیا دکھ ہے جو تم نمازوں میں اتنا روتے ہو۔" کہنے لگا۔ "خدا سے کچھ مانگنے کے لئے رویا نہیں کرتے! خدا سے عشق بھی کوئی چیز ہے"! چھٹی والا دن نوافل میں کٹتا۔ نمازِ اشراق باقاعدگی سے ادا کرتا۔ تلاوتِ قرآن کریم انتہائی درد و الحاح سے کرتا۔ مؤذن کی آواز سن کر جواد پر رقت طاری ہو جاتی۔ جواد کی پیدائش سے قبل والدہ صاحبہ محترمہ کو بشارت ہوئی تھی

"آمدِ جوادِ علی"

سلسلہ عالیہ احمدیہ سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ اور عہدِ طفولیت ہی سے اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ جماعت کے مضبوط اور مستحکم بابرکت نظام اور ذاتِ بابرکات سے والہانہ عشق تھا۔ اور آخر اسی پیار۔ اسی والہانہ عشق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۸ مارچ ۱۹۸۰ء کو اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

شہادت سے کئی ماہ قبل اس کو کئی خوابیں آئیں جن میں حضور کے ہاتھوں کسی بہت بڑے اعزاز کا ذکر تھا۔ شہادت سے چند روز قبل جواد نے رؤیا دیکھا کہ میں آپ ... کے ساتھ ایک

مجلس میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے چہرے پر خون کے دو نشان ہیں اور آپ فرماتے ہیں کہ جواد تمہارے چہرے پر یہ خون کے نشان کیسے ہیں ؟ اکثر کہا کرتا ہے "موت ہو تو شہادت کی" وہ تو اپنی مقدس منزل کو پا گیا۔ سرخرو ہو گیا۔ لیکن ہم کو دلفگار کر گیا۔ اشک پیازی اور دل کے پر کے ہمیں تحفہ میں دے گیا۔

بچپن سے تا دم آخر متعدد جماعتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ رہا۔ اسلام اور احمدیت کی خاطر اپنی جان۔ مال عزت اور وقت کو قربان کرنے کے لئے ہر دم تیار رہتا۔ دارالذکر سے رات گئے لوٹتا اور اپنی شہادت سے پہلی رات تو ڈیڑھ بجے تک خدام الاحمدیہ کے فرائض کی سر انجام دہی میں مصروف رہا اور نماز فجر کے معاً بعد پھر اپنے فرائض میں مصروف ہو گیا۔

بیکاری کے ایام میں بھی اپنے جیب خرچ سے ۱۸۰ روپے ماہانہ چندہ ادا کرتا رہا۔

انتہائی غیرت مند انسان تھا۔ اسے خوشامد سے نفرت تھی۔ ذاتی اغراض کے لئے کسی کا سہارا ڈھونڈنا اسے گوارا نہ تھا۔ وصیت نہ کر سکا مگر اس کا شدت سے احساس رہتا اور اپنے آپ کو شرائط وصیت کے مطابق ڈھالنے میں کوشاں رہتا۔ بڑے مضبوط ایمان کا مالک تھا۔ کہا کرتا تھا۔ "دین کا کام کرو۔ رزق کا انتظام خدا خود کر دے گا۔" پڑھنے لکھنے کا شوقین تھا اور

> کھلے جو آنکھ تو لوگ اس کو خواب کہتے ہیں
> جو عقل اندھی تو اس کو شباب کہتے ہیں
> وہ عمر جس میں کہ باقی ہے عقل نور دہا
> تم اس کو شیب کہو ہم شباب کہتے ہیں
>
> (کلام محمود)

ترقی کرنے کا خواہاں — لیکن زندگی نے مہلت ہی نہ دی۔

جواد کے کردار کا انتہائی دلفریب پہلو والدین سے عشق تھا۔ انتہائی مطیع و فرمانبردار بچہ تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک زندگی کے کسی بھی موڑ پر جواد کا والدین کے ساتھ اختلاف رائے نہیں ہوا۔ والدین بہن بھائی سبھی کیلئے جواد سرمایہ افتخار تھا۔ ماں سے پیار ایک چھوٹے بچے کی طرح لپٹ کر کرتا۔ ان کی دلجوئی کرتا اور ہر طرح سے ان کا خیال رکھتا۔ کبھی بیرون ملک جانے کی خواہش کرتا۔ تو ہم جواد جدائی کے تصور سے پریشان ہو جاتے۔ لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ تقدیر تو ہمیشہ کی جدائی دینے والی ہے۔

بڑا صابر و قناعت پسند تھا۔ کبھی اپنی بیماری یا پریشانی ظاہر نہ کرتا۔ لیکن کسی کو پریشان دیکھتا تو طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ روتوں کو ہنساتا۔ بذلہ سنجی اس کی عادت تھی۔ بات بات میں مزاح کا پہلو تلاش کرتا۔

انتہائی ہمدرد۔ خلیق۔ مونس و غمگسار انسان تھا۔ وہ۔ اس کا دل خدمتِ انسانیت کے جذبہ سے سرشار تھا۔ رواداری۔ خلوص۔ محبت کی اقدار پر اس کا ایمان تھا۔ بہن بھائیوں کے لئے دعائیں کرتا اور بزرگانِ سلسلہ سے دعائیں کرواتا۔

جواد دوسروں کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھتا نیکی و احسان بغیر کسی بدلے کی توقع کے کئے جاتا۔ برائی کا بدلہ بھی احسان سے دیتا۔ کسی کو حقیر و کمتر نہ جانتا۔ بلکہ اپنے حسنِ عمل سے دوسروں کو متاثر کرتا۔ اس کا دل آئینہ کی طرح شفاف تھا۔ کسی سے شکوہ نہ شکایت۔ انتہائی صلح جو اور امن پسند تھا۔ جھگڑے اور بدظنی سے نفرت کرتا تھا۔ گویا اس کی سرشت میں محبت و شفقت کا خمیر تھا۔ انتہائی فیاض تھا۔ مہمان کی خاطر و تواضع میں انتہائی دریا دلی کا ثبوت دیتا۔ کہا کرتا تھا کہ اپنی ذات پر خرچ کرتا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ بات تو تب ہے جب انسان اپنا نفس مار کر دوسروں کو دے۔

انتظامی صلاحیتوں سے قدرت نے اسے [illegible] تھا۔ جہاں کہیں بھی جاتا۔ لوگوں کے دل جیت لیتا۔ منفرد شخصیت کا حامل تھا۔

قرآن کے اصولوں پر عمل پیرا جواد ایک یکا مومن تھا۔ الغرض پیکرِ حسن و احسان۔ یکتا اور بے نظیر خوبیوں کا مرقع تھا۔ جو اپنی یادوں کے نقوش ہمارے دلوں پر ثبت کر گیا۔ ہمارے لئے راہِ عمل متعین کر گیا۔ اور ۲۶ سالہ مختصر سی زندگی ہی ہمیں درس دے گیا کہ "دین کی خاطر وقف ہو کر دین و دنیا ہر دو میں سرخرو ہو جاتا ہے انسان!!" ؎

راہِ مولیٰ میں جو مرتے ہیں وہی جیتے ہیں

خواجہ اعجاز احمد مرحوم

خواجہ اعجاز احمد مرحوم ۲۸ دسمبر ۱۹۵۴ء بروز جمعہ لاہور میں پیدا ہوا۔ اور پیارے اعجاز نے ابھی زندگی کی بیسویں بہار ہی مکمل کی تھی کہ ہماری بہاروں کو خزاں بنا کر ۸ مارچ ۱۹۸۰ء بروز ہفتہ لاہور سرگودھا روڈ پر پنڈی بھٹیاں سے پانچ میل دور کار کے حادثہ میں شہید ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

اعجاز نے دینی تعلیم گھر پر حاصل کی قرآن مجید ناظرہ والدین سے گھر پر آٹھ سال کی عمر میں مکمل کیا۔ درثمین اور کلام محمود سے بہت سے اشعار زبانی یاد تھے، مرکزی تربیتی کلاسوں میں شامل ہونے کے نتیجہ میں ترجمہ قرآنِ مجید بہت حد تک سیکھ لیا تھا۔ نماز فجر کے بعد تلاوتِ قرآنِ مجید باقاعدگی سے کرتا۔ سلسلہ کی کتب ہمیشہ زیرِ مطالعہ رہتیں۔

مروجہ ابتدائی تعلیم جونیئر ماڈل سکول اقبال روڈ پھر نصرت گرلز سکول دارالذکر لاہور سے حاصل کی۔ پرائمری کا امتحان اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔ ششم تا دہم ریلوے ہائی سکول لاہور مادرِ علمی رہا۔ اور میٹرک فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ایف ایس سی گورنمنٹ کالج باغبانپورہ اور بی ایس سی اسلامیہ کالج سول لائن سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کی۔ آخر ایم ایس سی فزکس پنجاب یونیورسٹی لاہور سے کی۔ اور ستاسی فیصد (۸۷٪) نمبر حاصل کر کے "اے" گریڈ میں پاس ہوا اور یونیورسٹی بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی اور ایک طرف نصرت جہاں سکیم کے تحت افریقہ بھجوانے کا فیصلہ فرمایا گیا۔ تھا تو دوسری طرف حضرت چوہدری محمد ظفر اللہ خان صاحب اور محترم پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی نظرِ شفقت سے پی ایچ ڈی کی تعلیم کا انتظام ہو رہا تھا کہ مولائے حقیقی کا بلاوا آگیا۔

عزیزم اعجاز نے بچپن سے ہی اطفال الاحمدیہ محمد نگر لاہور میں خدمت کی توفیق پائی۔ اطفال الاحمدیہ کے جلسوں کے لئے خصوصی کام کرنے کا شوق تھا۔ ذرا ہوش سنبھالی تو خدام الاحمدیہ میں خدمت کی توفیق ملنے لگی۔ نمازِ مغرب

> قدموں میں اپنے آپ کو مولا کے ڈال تو
> خوف و ہراس غیر کا دل سے نکال تو
> لعل و گوہر کے عشق میں دنیا ہے پھنس رہی
> تو اس سے آنکھ موڑ ہے مولا کا لال تو
>
> (کلامِ محمود)

کے بعد بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ خدام الاحمدیہ میں شمولیت کے جلد بعد قیادت ضلع لاہور میں بحیثیت ناظم مجلس خدمت کی توفیق ملی شعبہ تعلیم، تربیت، مال اور آخر میں شعبہ اطفال کے لئے خدمت کی سعادت پائی۔ دیہات میں اکثر دورہ پر جاتا رہتا۔ شہادت سے دو دن قبل چھ اور سات مارچ کو دورہ پر رہا۔ ضلع لاہور کے ایک گاؤں میں نماز جمعہ پڑھائی۔ اور اسی روز بعد نماز مغرب گھر پہنچا۔ اور اگلی صبح پھر تیار ہو کر ایک مقدس خدمت کی سرانجام دہی کے لئے کار میں روانہ ہوا۔ اور کار ایک سائیکل سوار کو بچاتی ہوئی ایک درخت کے ساتھ ٹکرا گئی۔ اور جامِ شہادت نوش کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

۹ مارچ ۱۹۸۰ء کو ایک بجے بعد دوپہر جنازہ ربوہ پہنچا اور حضور ایدہ اللہ تعالیٰ

بہشتی مقبرہ کے میدان میں نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔ موصی ہونے کی وجہ سے عزیزم کی تدفین بہشتی مقبرہ میں ہوئی۔ حضور نے جنازہ کو کندھا دیا۔ اور اپنے دستِ مبارک سے لحد میں اتارا قبر تیار ہونے تک تشریف فرما رہے۔ ہماری دلداری فرماتے رہے۔ آخر قبر تیار ہونے پر دعا فرما کر رخصت ہوئے۔

عزیزم خواجہ اعجاز احمد ایک اچھا مقرر تھا۔ اس کی طبیعت میں ایک جوش تھا اس کی تقریر سے ایک سماں بندھ جاتا۔ اس نے پہلی مرتبہ ۱۹۷۳ء میں قیادت مغلپورہ کے زیرِ انتظام تقریری مقابلہ میں حصہ لیا اور اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس کے بعد کئی تقریری مقابلوں میں نمایاں پوزیشنیں حاصل کیں۔ ایک دفعہ مرکزی سالانہ اجتماع میں اوّل آیا۔ گزشتہ سال سالانہ اجتماع کے موقعہ پر معیار خاص کے تقریری مقابلہ میں ضلع لاہور کی نمائندگی کی اور دوم پوزیشن حاصل کی۔ آخری مرتبہ قیادت اسلامیہ پارک کے ماتحت تقریری مقابلہ میں جو ماہِ فروری میں ہوا اوّل پوزیشن حاصل کی۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے تعلیمی لحاظ سے بہت روشن دماغ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی طلباء گھر پر آکر مدد لیتے اور وہ بڑی بشاشت سے ان کی مدد کرتا۔ عجیب بے نفس طبیعت تھی۔ کبھی اپنے آرام کا خیال نہ کیا۔ دوستوں سے گہری اور بے تکلف دوستی کا دائرہ وسیع تھا۔ غیر از جماعت شریف ساتھیوں سے بھی احمدیہ دائرۂ اخلاق کے اندر گہری بے تکلفی تھی۔ اکثر گھر پر مہمان نوازی کا موقعہ ملتا رہتا۔ عزیزوں اور رشتہ داروں سے بڑی محبت تھی اور وہ بھی اس کو دل سے چاہتے تھے۔ بچپن سے ہی بھولا بھالا تھا۔ اور شرم و حیا سے آنکھیں نیچی کئے رکھتا تھا۔ طبیعت میں سادگی اور انکسار کا، ہنستے اور مسکراتے ہوئے چہرے میں اخلاص اور پیار کی جھلک نمایاں تھی۔ نہایت درجہ رقیق القلب تھا۔ الغرض عزیز حسن و خوبی کا ایک عجیب امتزاج تھا۔

اگر اسے مہلت ملتی تو بھی خدا کے فضل سے خدمتِ دین کی توفیق پاکر زندۂ جاوید ہوتا۔ لیکن وہ تو چھوٹی عمر میں ہی محض خدا کے فضل سے زندۂ جاوید ہو گیا۔ اے اعجاز احمد ہم تیری جدائی پر غمگین اور اشکبار ہیں۔ لیکن اپنے مولا کی رضا پر راضی ہیں اور وہی کہتے ہیں جیسا قرآن نے ارشاد فرمایا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

بلانے والا ہے سب سے پیارا
اسی پہ اے دل تو جاں فدا کر

اے میرے پیارے خدا! مجھے اور عزیز کی غمزدہ والدہ اور دیگر عزیزان کو صبر جمیل عطا فرما اور مرحوم کی مغفرت فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ علیین کا مقام عطا فرما۔ اور ہم پسماندگان کی بھی مغفرت فرما کر انجام بخیر فرما۔ آمین۔

سیر و سیاحت

جناب ڈاکٹر پرویز پروازی

ایک دوست نے پاکستان سے استفسار کیا کہ جاپانیوں کی خوراک کے بارے میں کچھ بتلائیے سُنا ہے یہ لوگ چوہے تک کھا جاتے ہیں؟ تو صاحب یہ لوگ چوہوں کو ہرگز نہیں کھاتے۔ صرف انہیں پالتے پوستے، چومتے اور برکت کا موجب سمجھتے ہیں۔ البتہ سمندر کی کوئی بھی مخلوق ان کی دست برد سے محفوظ نہیں۔ جھینگا، گھونگھا، مچھلی، کیکڑا، سمندری سانپ، سب کچھ بڑی صفائی سے ہضم کر جاتے ہیں۔ رہے مینڈک! تو وہ اس ملک سے بھاگ کر تائیوان چلے گئے ہیں۔ جو بچ گئے ہیں وہ ابھی تک بچے ہوئے ہیں۔

ہم ایک دوست کے ہاں مدعو تھے کھانا کیا کھایا جہاد کیا۔ جہاد بھی شاید جہاد اکبر۔ سب سے پہلے سوپ (soup) پیش کیا گیا۔ اس میں ننھی منھی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ اور کھانے والے کو "ٹُکر ٹُکر" دیکھ رہی تھیں۔ زندہ نہیں... گویا زندگی میں باقاعدہ آنکھیں رکھتی تھیں"۔ ہم نے کچھ تذبذب کا اظہار کیا۔ تو میزبان نے فرمایا "مچھلی کھانے کی ضرورت نہیں صرف شوربہ پی لیجئے"۔ سو ہم نے آنکھیں بند کر کے آنکھوں سمیت اُبالی ہوئی مچھلی کا شوربہ سُڑک لیا۔ اتنی دیر میں ایک ڈش آئی پورے کا پورا کیکڑا تلا رکھا تھا۔ میزبان کی رال ٹپکنے لگی۔ اور ہم اِدھر اُدھر جھانکنے لگے۔ کہ اس کمبخت کے نظارے سے بچ سکیں مگر کہاں جس طرح چٹخارے لے کر میزبان نے اسے تناول فرمایا اور جس بے ادبی کے ساتھ ہم نے اسے ہاتھ لگایا وہ ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم لقمہ اندر بھیجتے تھے۔ معدہ اسے باہر دھکیلتا تھا۔ ہم اسی کھینچا تانی میں رہے اور یہ کیکڑا میزبان کے مبارک ہاتھوں تمام ہؤا تو ہماری جان میں جان آئی۔ ان کی بیگم نے کہا "شاید مہمانِ عزیز کو زیادہ پسند نہیں آیا۔ اچھا یہ کچی مچھلی بڑی لذیذ ہوتی ہے" لیجئے صاحب! ابھی ابھی جان ہار کیکڑے

سے چھٹکارا ملا تھا۔ اب یہ کچی مچھلی بتا رہے ہیں۔ مچھلی کے گوشت کے بڑے خوبصورت قتلے سامنے رکھے تھے۔ کہیں کہیں خونِ ناحق کی سُرخی بھی موجود تھی۔ میزبان نے کہا بسم اللہ کیجئے یہ دیکھئے کتنا خوبصورت ملائم گوشت ہے۔ سو ہم نے کچا گوشت بھی کھا لیا۔ اور میزبان کا دل رکھنے کے لئے اس کی لذت کی تعریف بھی کی۔ اس کے بعد چاول آگئے۔ سبحان اللہ! کیا لحیم شحیم چاول تھے۔ یہ موٹے موٹے ایک دوسرے سے گتھم گتھا، ایک طرف سمندری گھاس میں لپٹے ہوئے چاولوں کے گولے سے تھے کسی کے اندر سبزی کا قتلہ رکھا تھا۔ کسی کے اندر گوشت کا ٹکڑا، ایک کے اندر مچھلی جھانک رہی تھی۔ فرمایا۔ تناول فرمائیے۔ یہ ہمارے ہاں کا سب سے مرغوب کھانا ہے۔

چنانچہ وہ بھی کھائے۔ اور حسبِ تہذیب "اوئشی یعنی بہت لذیذ" کا نعرہ بھی لگانا پڑا۔ اس کے بعد کچھ سخن ہائے گفتنی و ناگفتنی کا دَور رہا اور جب معدہ کو تھوڑا سا آرام مل چکا تو کھانے کا دوسرا دور شروع ہوا۔ یہ دَور واقعی لذیذ دَور تھا۔ قیمے کے قتلے تھے۔ کچھ ہمارے ہاں کے کباب کی سی خوشبو بھی آرہی تھی۔ مچھلی کا پلاؤ تھا۔ سویابین سے تیار کئے ہوئے نرم نرم نمکین ٹکڑے سے تھے۔ گول گول تلے ہوئے پکوڑے سے تھے۔ غرض ہم نے میزبان کا دل رکھنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی رغبت سے وہ سارا کچھ ہڑپ کر لیا۔ اور بدقسمتی سے کہہ بیٹھے کہ یہ قیمے کے قتلے بڑے مزیدار تھے۔ فرمایا "ہاں! کیکڑے کا قیمہ بہت ہی مزیدار ہوتا ہے" ہم نے ایک لمبی "ہوں" کی اور ابھی اس خطا پر نادم ہو رہے تھے کہ ارشاد ہوا "یہ جو پکوڑے ہیں ان کے اندر سمندری سانپ کا گوشت بھرا ہوا تھا۔ کیا آپ کو پسند نہیں آئے؟" اب

ع کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔

اس کے بعد کھانے کا تیسرا دَور بھی ہوا مگر وہ "مولویانہ" دَور تھا۔ یعنی سب کچھ مرغی کے گوشت سے تیار کیا گیا تھا۔ چوتھا دَور کھانے کا نہیں پینے کا تھا اور خوب دَور چلا۔ میزبان نے جوش صاحب کی طرح گھڑی رکھنے کی بجائے حجاز مرحوم کی طرح گھڑا رکھ کر پی اور ہم چائے کی فنجان میں غرق رہے۔ جب رخصت ہوئے تو فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی جاپانی کھانے کی دعوت قبول نہیں کریں گے۔

مگر آپ سے جھوٹ کیوں بولیں ہم بھی ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد کے مصداق کیکڑے کا گوشت پسند کرنے لگے ہیں۔ اس کمبخت کے پکوڑے تو بہت ہی لذیذ بنتے ہیں۔ یہ دیکھئے! تلا رکھا ہے اور کیسی سوندھی سوندھی خوشبو آرہی ہے۔ تناول فرمائیے آپ تو تکلف کر رہے ہیں۔ یہ مچھلی بھی چکھیے، بُو آتی ہے؟" نہیں، بُو تو نہیں آتی بس تا ہے

کبھی ہوتی تھی۔ جب سے ہم جاپان میں آئے ہیں۔ اس کی بُو ختم ہو گئی ہے۔"

جاپانی کھانوں میں "نیم پورہ" اور "سکی یاکی" بہت لذیذ اور مزیدار کھانے ہیں تفصیلات پوچھنی ہوں تو بیگم اختر ریاض الدین سے پوچھ لیں۔ مگر عام لوگوں کی غذا چاول ہے۔ اور اس کے ساتھ گاڑھا شوربہ۔ جسے یہ لوگ "کلے رائس" کہتے ہیں۔ یہ کلے انگریزی CURRY کا جاپانی چربہ ہے مگر مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات! جاپانی حضرات لام کی جگہ رے اور رے کی جگہ لام کی آواز نکالتے ہیں۔ وہ حضرات بھی جو شین قاف سے درست ہوں گے لام پہ آ کر رام اور رام پہ آکر لام ہو جائیں گے۔ جاپان میں آکر "برٹر بینڈ رسل" بل ٹلنڈ لسر" ہی جائے گا۔ مہر علی اور الو کی کے زمانہ میں الو کی صاحب نے جبھی تو فرمایا تھا کہ میں "ار" کو مسل کر رکھ دوں گا۔ کیونکہ اُری جاپانی زبان میں چیونٹی کو کہتے ہیں۔

بات کھانوں سے چلی اور چہتے چہتے یعنی چلتے چلتے مگر بازی تک آ گئی۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ حضرات سکی یاکی کو اوساکے کا چھینٹا دے کر تیار کرتے ہیں۔ اور اوساکے جاپان کی مشہور شراب ہے۔ ہم تو اس اوساکے کا نام سُنکر ایسا بدکے ہیں کہ "سکی یاکی" تک نہیں کھاتے۔ گھر میں تیار کرنے کی کوشش کی ہے

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

اور یہ مولوی مدن ہمارے دوست یاماگوچی صاحب ہیں جن کی دعوت پہ ہم نے سکی یاکی چٹخارے لے لے کر کھائی اور بعد میں اوساکے کی خبر پاکر کلیاں کرتے پھرے۔

"اوساکے" کا اصلی نام صرف "ساکے" ہے۔ مگر جاپان والے جس چیز کا نام بہت ہی احترام اور محبت اور تقدس سے لینا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ "او" کا لفظ زائد کرتے ہیں۔ سو اوساکے کا مطلب ہے۔ ساکے شریف۔ مثلاً اگر ہم جاپانی میں گولڑہ شریف کہنا چاہیں تو "اوگولڑہ" کہہ دینا کافی ہے اور کسی تردد کی ضرورت نہیں۔

جاپان میں ہمیں ایک اور لفظ نے پریشان کئے رکھا۔ وہ لفظ "سان" ہے۔ جس کا مطلب ہے۔ صاحب مثلاً زید صاحب کو زید سان اور بکر صاحب کو بکر سان کہتے ہیں۔ مگر حدّ یہ ہے کہ یہ حضرات بلّی کو بھی بلّی سان اور چوہے کو چوہا سان کہتے ہیں۔ پہاڑ کو بھی پہاڑ سان۔ فیوجی یا ماجو جاپان کا سب سے اونچا اور مقدس پہاڑ ہے فیوجی سان کہلاتا ہے۔ سان کا لفظ مذکر مؤنث دونوں کے لئے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ جاپانی لوگ مرد اور عورت کو دونوں کو ایک ہی "سان" سے ہانکتے ہیں۔ مگر اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پڑھتے تو "سان" ہیں مگر

لکھتے "سان" ہیں۔ مثلاً جاپان سے کسی مشاعرہ کا دعوت نامہ بھیجا جائے تو وہ اس فہم کا ہوگا۔ کہ "اس مشاعرہ میں کشور ناہید سان اور یوسف کامران سان کے علاوہ استاد دامن سان بھی شرکت فرمائیں گے"

آج کل جاپان میں لگا ہے گا ہے باز خواں این قصۂ پارینہ را کے مصداق لاک ہیڈ سکینڈل (LOCK HEED) کا بار بار تذکرہ ہو رہا ہے۔ یہ لاک ہیڈ سکینڈل بھی ایک عجیب بحرِ بے کراں ہے اور ؎

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کیلئے

اور ہمارے لئے تو ذاتی طور پر بھی یہ سکینڈل بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیوں؟ یہ بھی سن لیجئے۔

ایک روز ہم یونیورسٹی سے باہر نکلے تو ایک شناسا سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ ان کے ساتھ کوئی اور شناسا تھے۔ آپ نے تعارف کروایا کہ یہ پاکستانی چودھری ہیں تو ان صاحب نے عجیب تحقیر آمیز طنز کے ساتھ فرمایا "پاکستانی؟ اچھا! اچھا!!" ہمیں بہت تاؤ آیا۔ مگر کیا کر سکتے تھے۔ خون کے گھونٹ پی کر چپکے ہو رہے! مگر ذہن عجیب خلجان میں گرفتار تھا۔ کہ کسی جاپانی نے ایسی بد تمیزی کیوں کی ہے۔ پھر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ حضرت نشے میں ہوں گے۔ اور اس ملک میں نشے میں کی ہوئی ہر حرکت قابلِ عفو و درگزر ہے۔ مگر اگلے روز صبح سویرے انگریزی اخبار ملا تو ہمیں معلوم ہوا کہ وہ حضرت نشے میں نہیں تھے۔ یہاں انگریزی اخباروں میں عموماً باسی خبریں چھپتی ہیں اس لئے جس خبر نے ہمیں ایک دن بعد پشیمان کیا۔ وہ ایک دن پہلے ان کی نگاہوں سے گزر چکی تھی۔ خبر یہ تھی کہ ہمارے کچھ حضرات ایک طیارہ میں طیاروں کے فالتو پرزے خریدنے کے لئے یورپ کے ایک ملک میں گئے۔ تو اتنے بڑے طیارے کو خالی لے جانا مناسب نہیں سمجھا۔ تھوڑی سی چرس بھی ساتھ لیتے گئے۔ ادھر اُن لوگوں نے غیر انسانی حرکت یہ کی تھی کہ کتوں کو چرس سونگھنے پر مامور کر رکھا تھا۔ ان کتوں نے سونگھ کر بتا دیا کہ اس طیارہ میں چرس ہے۔ لہٰذا وہ حضرات۔ انسانوں کے ان ازلی دشمنوں کے کہنے پر دھر لئے گئے۔ ؎ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق!

تب ہمیں معلوم ہوا کہ اس جاپانی نے یہ غیر جاپانی حرکت کیوں کی تھی۔ مگر قصور اپنا تھا اس لئے ہم منہ چھپاتے پھرے۔ ۲، ۱ کے کچھ اور بعد ہی اس سکینڈل کا انکشاف ہوا تو ہم بھی اس قابل ہوئے کہ سر اٹھا کر چل سکیں ورنہ یہ جاپانی تو ہمیں کہیں کا نہ چھوڑتے۔ ؎!

رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم!!

لاک ہیڈ کے چھینٹے بہت دور دور تک اڑے ہیں۔ مگر ہم مشتے از خروارے کے طور

پر تبرکاً چند چھینٹوں کا تذکرہ کریں گے۔ مگر واقعات سننے سے پہلے اسماء الرجال یعنی شخصیات سے تعارف حاصل کر لیجئے تو زیادہ بہتر ہے۔

کرامہ یوشیو

داہنے بازو کے سیاسی جوڑ توڑ کے ممتاز ماہر عمر ۶۹ سال اندازاً جائیداد تقریباً پندرہ کروڑ ڈالر۔ کنگ میکر کے نام سے معروف تھے۔

مسٹر اوسانو کینجی

دائیں بازو کے سیاسی چال باز، عمر ۵۹ سال۔ جاپان میں جائیداد دس کروڑ ڈالر، امریکہ اور ہوائی میں تقریباً بیس کروڑ ڈالر۔

مسٹر تناکا کاکوئے

جاپان کے [illegible] وزیر اعظم، دائیں بازو کی حکومتی پارٹی ایل، ڈی، پی کے سابق چیئرمین اندازاً جائیداد [illegible] کروڑ ڈالر۔

ماروبینی کارپوریشن

جاپان کا مشہور تجارتی ادارہ غیر ملکی تجارت میں سب سے اوّل (اوساکا میں پاکستان کے اعزازی قونصل جنرل اسی ادارہ کے ایک بڑے افسر ہیں) لاک ہیڈ کے باقاعدہ ایجنٹ۔

اے این اے۔ آل نپن ایرویز۔ جاپان کی اندرونی پروازوں کی اجارہ دار کمپنی۔

بات صرف اتنی سی تھی کہ لاک ہیڈ کارپوریشن نے اپنے ٹرائی سٹار جیٹ طیارے فروخت کرنے کے لئے جاپان کے دو مشہور بل ڈوزروں کی خدمات حاصل کیں۔ کہ وہ ان طیاروں کی فروخت کے لئے زمین ہموار کریں۔ چنانچہ کرامہ صاحب اور اوسانو صاحب نے بڑی محنت سے زمین ہموار کی اور محنتانہ کے طور پر ستر لاکھ ڈالر وصول پائے ماروبینی کارپوریشن والوں سے یہ رقم ادھر سے وصول کی اور ادھر ادا کر دی۔ مگر صرف ذرا سی غلطی یہ کی کہ رسید لکھتے وقت سو ملین ین کی بجائے صرف یہ لکھا کہ "سو مونگ پھلیاں وصول پائیں" دوسری رسید پہ یہ لکھ دیا کہ "یونٹ وصول پائے" اب جواب دہی کرتے پھر رہے ہیں کہ مونگ پھلیاں کدھر گئیں ہیں اور یونٹ کس کھاتے میں ڈالے گئے ہیں۔

وہ دلولے کہاں؟ وہ جوانی کدھر گئی؟

جب مونگ پھلیوں کا لفظ مشتبہ ہوا تو جاپان میں زلزلہ سا آگیا۔ کرامہ صاحب اور اوسانو صاحب اور ماروبینی والوں کے لئے باوجود فراخی کے زمین تنگ ہو گئی۔ بات یہ پوچھی گئی کہ ان لوگوں نے اتنی رقم جو زمین ہموار کرنے پر صرف کی۔ وہ کس کس کو دی ہے۔ یعنی کس کس کی مہر [illegible] لگی ہوئی۔ یہ بات یہیں سے شروع ہوئی اور تناکا صاحب تک پہنچ گئی۔

جو اس زمانہ میں یعنی ۱۹۷۵ء میں وزیر اعظم تھے۔ ڈائٹ یعنی پارلیمنٹ میں جواب دہی کے لئے سب لوگ بلائے گئے اوسانو صاحب کی جواب دہی کا سارا منظر ٹیلیویژن پر براہ راست نشر ہوتا رہا۔ ہم نے بھی دیکھا اوسانو صاحب اتنے اطمینان سے جوابات دیتے رہے۔ ان کے لئے اس چیز کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ کدامہ صاحب البتہ ہمارے محاورہ کے مطابق "یرک" گئے۔ پہلے شاید جھوٹ موٹ بیمار ہوئے اور پھر سچے بیمار ہو گئے۔ اور اب تک بیمار چلے آتے ہیں۔ درمیان میں ایک بار حالت بگڑ گئی۔ ایمبولینس میں ڈالے گئے۔ ہسپتال تک پہنچے مگر خلقِ خدا ان کے دیدار سے فیضیاب ہونے کیلئے جمع ہو گئی۔ پولیس بلائی گئی مگر بے فائدہ۔ کدامہ صاحب ہسپتال میں داخل نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر انہیں واپس لے آئے۔ ع

الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا۔

اس دوران حکومتی پارٹی کے اراکین کے درمیان ٹھن گئی۔ تنا کا صاحب کے حامیوں اور میکی صاحب کے حواریوں میں جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ حکومت ڈانوا ڈول ہو گئی۔ اور لاک ہیڈ کا چرچا شہ سرخیوں سے ہٹ کر گوشۂ گمنامی میں جانے ہی والا تھا کہ پورنو فلموں کے ایک مشہور اداکار نے اپنی جان کی قربانی دے کر اس مسئلہ کو دوبارہ اچھال دیا۔ اس ۲۹ سالہ نوجوان اداکار نے فلائنگ کلب کا ایک چھوٹا طیارہ لیا۔ "کامی کازے" والوں کی وردی پہنی اور داغ دیا ڈانٹے، کدامہ صاحب

کے دولت کدہ پر عین اس مقام پر اپنا طیارہ دے مارا جہاں ان کی خواب گاہ تھی۔ پیچھے جو نوٹ چھوڑا اس میں لکھا کہ "میں اپنی جان دے کر اپنے ملک کو ایسے بددیانت لوگوں کے وجود سے پاک کرتا ہوں۔ جو جاپان کی بدنامی کا باعث بنے ہیں۔" کدامہ صاحب قسمت کے دھنی نکلے وہ اس وقت خواب گاہ میں نہیں تھے۔ دولت کدہ کو تھوڑا بہت نقصان پہنچا مگر مجموعی طور پر سب خیریت رہی۔ لاک ہیڈ کا چرچا پھر تازہ ہو گیا۔ ضمیموں پر ضمیمے شائع ہوئے کچھ واہ واہ ہوئی۔ کچھ لعنت ملامت! اور پھر ہوا کا رُخ حکومت کے اندرونی خلفشار کی طرف ہو گیا۔ تناکا صاحب گرفتار ہوئے۔ ماروبینی والے دھر لئے گئے۔ اے این اے کے مینیجنگ ڈائرکٹر اندر ہو گئے۔ ؎

ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا۔

مگر کدامہ صاحب اور اوسانو صاحب بستر عدالت پر دراز رہے۔ پولیس کے ہسپتال میں پہنچے صرف ڈاکٹر کی موجودگی میں پولیس والوں کو انہیں دیکھنے کی اجازت ملی۔ کچھ پوچھتے پاچھتے رہے اور کوئی الزام ثابت نہیں کر سکے۔ تناکا صاحب اکیس دن عام قیدیوں کے ساتھ سی کلاس میں سڑتے رہے اور یہی حال دوسروں کا ہوا۔ آخر ضمانت پر رہا ہوئے اور پھر ولولۂ تازہ لے کر میدان میں کود پڑے۔

میکی صاحب جو ابھی کچھ دن پہلے تک وزیرِ اعظم تھے بڑے سخت جان نکلے۔ باوجود پارٹی کے اندرونی خلفشار کے مستعفی ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اور بار بار اس عزم کا اظہار کیا کہ لاک ہیڈ سکینڈل کے تمام کرداروں کو بے نقاب کر کے کیفرِ کردار تک پہنچاؤں گا۔

ایک رات دو بجے کے قریب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، وزیر اعظم صاحب کو جگایا گیا۔ کہ پراسیکیوٹر جنرل کسی اہم مسئلہ پر آپ کی راہنمائی چاہتے ہیں۔ چنانچہ پراسیکیوٹر جنرل صاحب نے وزیرِ اعظم کو بتایا کہ ان کے ایک دستِ راست اس سکینڈل میں ملوث پائے گئے ہیں۔ ان کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ ہاں اگر آپ چاہیں تو ان کو بچایا بھی جا سکتا ہے۔ میکی صاحب بہت پریشان ہوئے مگر اصول کے پکے نکلے۔ ذاتی طور پر دخل دینے سے انکار کر دیا۔ اگلے روز معلوم ہوا کہ پراسیکیوٹر جنرل نے وزیرِ اعظم کو کوئی ٹیلیفون نہیں کیا۔ یہ سب کچھ جعلی تھا اور محض وزیر اعظم کو پھنسانے کے لئے کیا گیا تھا۔ کچھ روز بعد کیوتو ڈسٹرکٹ کورٹ کے ایک جج پراسیکیوٹر جنرل اور وزیر اعظم کی گفتگو کی ٹیپ لے کر ایک اخبار کے دفتر میں تشریف لائے اور اخبار نے وہ گفتگو تمام و کمال شائع کر دی۔

ایک بار زلزلہ سا آگیا۔ مگر میکی صاحب نے بظاہر کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس پر وہ دھرے جاسکیں۔ لہٰذا جج صاحب پہ الزام آگیا کہ انہوں نے پراسیکیوٹر جنرل بن کر وزیرِ اعظم کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے جج صاحب صاف مُکر گئے کہ میں نے ایسا نہیں کیا مجھے یہ ٹیپ ایک معتبر ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے مگر میں اپنے ذاتی استحقاق کی بناء پر اس معتبر راوی کا نام بتانے سے انکار کرتا ہوں۔ سپریم کورٹ میں جواب دہی کے لئے بلائے گئے وہاں بھی آپ نے یہی موقف اختیار کیا۔ سپریم کورٹ نے گورنر جنرل کو سفارش کی ہے۔ کہ ان جج صاحب کو برطرف کر دیا جائے۔ اگرچہ ان کے خلاف قطعی ثبوت کوئی نہیں مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انہی حضرت کی حرکت ہے۔ آج کل جج صاحب کی خبریں نمایاں طور پر چھپتی ہیں۔ بعض اخبارات نے تو موصوف کی نوجوانی کے ایام سے لے کر اب تک کے حالات پر باقاعدہ تحقیقاتی مقالے شائع کئے ہیں۔ مگر جج صاحب ہیں کہ ابھی تک ڈٹے بیٹھے ہیں۔

ع جب غرور ہو آئے کر لے شکار مجھے

میکی صاحب نے اپنے تحفظ کے لئے آخری حربہ آزمایا یعنی پارلیمنٹ کو توڑ کر نئے الیکشن کروائے۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے، ایل ڈی پی کو کامیابی تو حاصل ہو گئی مگر اتنی سیٹیں نہیں مل سکیں جتنی حکومت بنانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ لہٰذا میکی صاحب نے شکست کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا

اور نئے وزیر اعظم نے صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے نئی حکومت بنائی۔ تناکا صاحب اور پارلیمنٹ کے وہ تمام اراکین جو لاک ہیڈ سکینڈل میں ملوث سمجھے جاتے تھے آزاد اُمیدواروں کی حیثیت سے دوبارہ منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں پہنچ گئے ہیں۔ ع

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق!

اور اب نئے وزیر اعظم صاحب نے پھر اعلان کیا ہے کہ تحقیقات مکمل ہو چکی ہے اس لئے عنقریب رپورٹ شائع کر دی جائے گی۔ خدا معلوم یہ رپورٹ شائع ہو گی یا نہیں۔ مگر ایک بار پھر اس سکینڈل نے شہ سُرخیوں پہ قبضہ جما لیا ہے۔ اور ٹی وی پہ بار بار اعداد و شمار نشر کئے جا رہے ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے میکی صاحب وزیر اعظم تھے اور اب (۱۹۷۶ء میں) فکودا صاحب وزیر اعظم ہیں۔ ع

یہ چمن یونہی رہے گا اور ...... الخ

جاپان آنے سے پیشتر ہم نے جاپان کے بارہ میں دو سفر نامے بڑے شوق سے پڑھے تھے ایک کیپٹن ایس ایم ادریس کا بسنگ آمد اور دوسرا بیگم اختر ریاض الدین کا "سات سمندر پار"۔ بسنگ آمد تو فاضل مصنف نے کرنل محمد خان کی بجنگ آمد کے جواب میں لکھی ہے اور اسی خلوص اور ولولے سے لکھی جس خلوص اور ولولے سے استاد امام دین نے بانگِ درا کے جواب میں بانگِ دہل لکھی تھی اور فی الواقع بسنگ آمد اور بجنگ آمد میں یہی فرق ہے جو بانگِ دہل اور بانگِ درا میں ہے۔ ع

بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

دوسرا سفرنامہ بیگم اختر ریاض الدین کا تھا "سات سمندر پار" یہ سفرنامہ ہمارے ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔ اور ادبی چاشنی میں اپنی مثال آپ! مگر اس سفرنامے نے ہمیں بہت دھوکا دیا۔ اگرچہ قصور اپنا تھا کہ یہ نہ سوچ سکے کہ یہ سفرنامہ دس سال پہلے کا ہے اور ہم دس سال بعد اس ملک میں جانے والے ہیں۔ فرمایا بیگم اختر ریاض الدین نے کہ "ٹوکیو میں شائد ٹیکسی دُنیا بھر سے ارزاں ہے۔ روپیہ سوا روپیہ میں آپ کو ٹیکسی والا کہاں سے کہاں پہنچا دے گا۔ مگر آج کل جاپان میں ٹیکسی کا کرایہ دو کلومیٹر کے لئے ۲۸۰ ین ہے اور ۲۸۰ ین کا مطلب ہے تقریباً نو روپے تیس پیسے۔ وہ پاؤنڈ جو اس زمانہ میں ایک ہزار ین کے برابر تھا۔ اب صرف ۵۸۰ ین کے برابر ہے اور ڈالر بھی پچھلے چھ مہینوں سے ۲۹۰ اور ۲۹۵ ین کے درمیان لٹک رہا ہے۔ ین بہت تگڑا سکہ ہے مگر جاپان والے اس کے بوجھ تلے پس رہے ہیں۔ قیمتیں دھڑا دھڑ بڑھ رہی ہیں اور تنخواہ داروں کے لئے یہاں بھی مضمون واحد ہے۔ پھر فرمایا بیگم صاحبہ

تے کہ میرا بٹوہ ہمیشہ پچاس ساٹھ ہزار ین سے بھرا رہتا تھا اور میں اپنے آپ کو رئیسہ سمجھ کر سر اونچا کر کے چلتی تھی۔ ہم نے جب جاپان والوں کی طرف سے آئی ہوئی پیشکش دیکھی تو ہماری تنخواہ ان پچاس ساٹھ ہزار سے چار پانچ گنا زیادہ تھی۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ قبول کر لی۔ اور آنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو رئیس سمجھنے لگے اور جب سے یہاں آئے ہیں۔ مسلسل بیگم ریاض الدین کو یاد کرتے ہیں۔ ہمارے بزرگ مولٰینا صلاح الدین احمد کی عزیزہ ہوتی ہیں۔ ورنہ ان کی شان میں گستاخی کے کلمات بھی سرزد ہو جاتے تو بعید نہ تھا! پھر ارشاد ہوا کہ" ایک شے باہر والے نہیں خریدتے اور وہ ہے جاپانی موٹر کار اس کی سچائی کا اندازہ تو ہمیں پاکستان میں ہی چیونٹیوں کی طرح فوج در فوج اور موج در موج جاپانی موٹر کاریں دیکھ کر ہو گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود ہم نے نئی گاڑی کے خواب وہیں سے دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اب بھی دیکھتے ہیں مگر ذرا احتیاط کے ساتھ!

بات یہ ہے کہ بیگم صاحبہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ لکھا ہے اور ہم بھی جو کچھ لکھنے لگے ہیں۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ لکھیں گے۔ پچھلے دس سالوں میں جاپان میں مہنگائی بھی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ بڑھی ہے۔

رہی سہی کسر تیل کے قضیہ نے نکال دی۔ اب تو یہ حال ہے کہ سوائے ہوا کے اور کوئی چیز سستی نہیں۔ اور ہوا بھی ناصاف اور ناپاک۔ جی تو چاہتا ہے کہ کچھ تفصیلات نرخنامے کے طور پر بیان کر دوں کہ پاکستان والوں کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔ مگر فائدہ؟ یہاں آنے والے جانی سے شرط بدکے آتے ہیں سہ

زیاں ہے عشق میں یہ ہم ہی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کیلئے

یہاں تک جتنے پاکستانی مسافروں سے ملاقات ہوئی ہے۔ سوائے سیٹھ محبوب الٰہی کے سب کے سب سود و زیاں سے بے نیاز نظر آئے۔ اور سیٹھ محبوب الٰہی کو تو اللہ غنی! واقعی کوڑی کوڑی کی اشیاء کرتے دیکھا۔ اتفاق سے ہم اور وہ اوساکا کے ممتاز پاکستانی تاجر عدنان صاحب کے ہاں مدعو تھے۔ عدنان صاحب اپنی مروت۔ سیرچشمی۔ ہمدردی اور خلوص کی وجہ سے مرجع پاکستانیاں ہیں۔ سیٹھ محبوب صاحب جلدی ہوٹل واپس لوٹنا چاہتے تھے۔ ہم نے کہا۔ بھائی ٹھہرو اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ فرمایا "جلدی اس لئے ہے کہ پاکستان سے ٹیلیفون آنے والا ہے اور میں یہاں سے ٹیلیفون کرکے فارن ایکسچینج ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔ آفرین ہے ہمیں ان کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ ان کے علاوہ جن پاکستانیوں سے ملاقات ہوئی ان کی حرکات و سکنات اور پیشہ وارانہ مہارت کا عالم ہی اور تھا۔

اوساکا کی زمین دوز ریل کا سب سے اہم اور مرکزی اسٹیشن اومیدا OMEDA ہے۔ تقریباً ساری زمین دوز ریلیں یہاں سے ہو کر گزرتی ہیں اور رشید قیصرانی یاد آتا ہے جس کا شعر ہم نہایت بے محل استعمال کرنے لگے ہیں۔

جاتی ہیں ترے گھر کو سبھی شہر کی سڑکیں
لگتا ہے کہ سب لوگ تیری سمت رواں ہیں

اس زمین دوز سٹیشن کے ساتھ کوئی تین چار مربع میل میں پھیلا ہوا بہت بڑا زیر زمین شاپنگ سنٹر ہے۔ جو "یادِ غزال چشماں ذکرِ سخن عذاراں" کی وجہ سے قابلِ دید تو ہے۔ قابلِ خرید ہرگز نہیں ہے۔ ہم کراچی یونیورسٹی کے پروفیسر اسلم شاہ صاحب کو اس شہر نگاراں کی سیر کرواتے پھر رہے تھے کہ سامنے تین پاکستانی شکلیں نظر آئیں۔ ایک صاحب کو دیکھ کر ہم چونک پڑے ہمارے چیفس کالج لاہور کے زمانے کے ایک شاگرد معلوم ہوتے تھے قریب آئے علیک سلیک ہوئی۔ ہمیں بہت تاؤ آیا کہ شاگرد ہو کر استاد سے ایسی رسمی اور سرسری علیک سلیک کر رہا ہے۔ ہم نے نام لے کر کہا" آپ ہمیں پہچانتے ہیں"۔ جواب ملا "جی میں نہیں پہچانتا جن صاحب کا آپ نام

لے رہے ہیں۔ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔" ہم نے کہا چلو خیر گذری۔ ورنہ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے۔ وہ ہمارے استادانہ غرور کو توڑنے کے لئے بہت کافی تھا۔ ہوا یوں کہ گلبرگ کی مین مارکیٹ میں ایک کیمسٹ سے دوا خریدنے کے لئے ہم دوکان کے اندر گئے تو پنجاب کے اس زمانہ کے ایک نئے نویلے گورنر صاحب سے ڈبھیڑ ہو گئی۔ ہمیں دیکھ کر کچھ ٹھٹھک گئے اور از راہ رعایا پروری فرمایا آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ ہم نے عرض کی جی ہاں ضرور دیکھا ہو گا کسی زمانے میں آپ چیفس کالج میں ہمارے شاگرد ہوا کرتے تھے۔ سو یہاں شاگرد کے بھائی پر ہمیں جو تاؤ آیا تھا وہ ہرن ہو گیا۔ باتوں سے معلوم ہوا کہ تجارت کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔ اور ایک ہفتہ سے اوساکا کے سب سے مہنگے ہوٹل میں پڑے سڑ رہے ہیں۔ کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملا۔ جس سے بات چیت کر سکیں۔ ہم نے کہا بھلے آدمی جاپان آنے سے پہلے کسی مناسب ٹریڈنگ ایجنسی سے بات چیت کی ہوتی تاکہ وقت اور پیسہ ضائع نہ ہوتا۔ جواب ملا جی! ذرا آنے کی جلدی تھی۔ اس لئے چلے آئے۔ ہم نے کہا میاں! سچ کہتے ہو جس کے پاس وافر پیسہ ہوتا ہے اسے ہر جگہ جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم نے بساط کے مطابق ان کی خاطر تواضع کی۔ مناسب لوگوں سے ان کا تعارف کروایا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان حضرات نے مزید تین ہفتہ یہاں قیام کیا۔ اور اس کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے واپس سدھارے۔ کاروبار تو وہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ جاپان کی سیر بہت ضروری تھی۔ وہ

علم و ادب

(جناب لئیق احمد طاہر - ربوہ)

کتاب بہترین ساتھی ہے

"کچھ عرصہ پیشتر لاہور کے ایک صاحب نے "کتاب بہترین ساتھی ہے" کے عنوان سے ایک کل پاکستان مقابلہ مضمون نویسی کروایا تھا جس میں یہ مضمون "گولڈ میڈل کا مستحق قرار دیا گیا" (ادارہ)

دنیا میں کاغذ اور روشنائی دن اور رات کی مانند ہیں۔ جب گردشِ لیل و نہار کسی چیز کو تہ و بالا کر دیتی ہے تو کاغذ اور سیاہ روشنائی اسے پھر سے شائع کر کے حیاتِ جاودانی بخشتے ہیں۔ کتاب کسی مصنف کی عمر بھر کی کمائی ہوتی ہے۔ اُس کے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ۔ علمی عجائب و غرائب کی تحصیل کے لئے کتابیں ایک بہت بڑا عطیۂ خداوندی ہیں یہ گویا ایک بزم ہے جس میں آسمانِ علم و ہنر کے سینکڑوں درخشندہ ستارے سرگرم گفتگو ہوں۔ ہر مصنف کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تحریر لوحِ زبان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقش ہو جائے۔ اسی خیال کے پیش نظر وہ اپنی تحریر کو زیادہ سے زیادہ نکھار کر قاری کے سامنے لاتا ہے۔ بے شک ایسی کتاب انسان کی بہترین دوست ہوتی ہے۔

ایک وقت تھا کہ لوگ کسی ایک صاحب علم سے استفادہ کرنے کے لئے سینکڑوں میلوں کی کٹھن مسافت طے کرتے تھے مگر آج ہم اسی ہمدم کی بدولت سمندروں اور صحراؤں کے سینے چیرے بغیر گھر بیٹھے زمانہ حال اور سینکڑوں سال پہلے کے علماء کی بزم سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور اُن کی معیت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ ؎

ہے سامنے کتاب کہ رکھا ہے جامِ جم
بیٹھا ہوں اور سیرِ جہاں کر رہا ہوں میں

آج مشرق کا ایک صحرا نشین مغرب کے شہنشاہ کے دربار کی ایک ایک سرگوشی کا علم حاصل کر سکتا ہے تو محض اسی ہمدم کی بدولت جس غمگسار ساتھی کی بدولت درد مند دلوں کے رنج مسرتوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ بے چینیاں ماند پڑتی گئیں۔ اطمینان و سکون نے گھبراہٹ اور بے چینی کی جگہ لی۔ خلوت نے جلوت کو رو بہ دھارا پژمردہ انسانی گلزارِ زندگی کا ترو تازہ پھول بن گیا وہ یہی ہمدم دائمی و غمگسار ہے۔ اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس کے مسکن و مولد کا علم حاصل کر کے اپنے اپنی بزم میں آنے کی دعوت دیں اور پھر ہم جو عموم

کے ہجوم سے نجات پاکر رباب حیات میں ایک نئے ساز کا آغاز کریں۔

ہمارے اس ساتھی کی پیدائش کا آغاز ہماری پیدائش کی مانند مٹی سے ہوا۔ آج سے دو ہزار سال قبل دنیا موجودہ نفیس کاغذ سے ناواقف تھی۔ علم مٹی کی بڑی بڑی تختیوں پہ محفوظ کیا جاتا تھا۔

ابتدا میں چینیوں نے ریشم سے کاغذ بنایا مگر اسے استعمال کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہ تھا بلکہ یہ شہزادوں اور امراء کا کام تھا کیونکہ ریشم سے بنا ہوا کاغذ بہت مہنگا ہوتا تھا۔ مسلمانوں نے ایک حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا۔ جو کاغذ ریشم سے بن کر بہت مہنگا پڑتا تھا مسلمانوں کے ہاتھوں پٹ سن سے بننے لگا۔ جسے ہر امیر و غریب استعمال کر سکتا تھا۔ اس طرح مسلمانوں نے اس فن کو ارزاں بنا دیا اور کاغذ ہر امیر و غریب کے استعمال کی چیز بن گیا۔ آج کاغذ کا دور ہے اور اس کی اس قدر فراوانی ہے کہ کسی کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ قرطاس سازی کے فن نے کتنے مراحل طے کئے اور کس طرح اس مفید خاص و عام صنعت نے ساری دنیا میں عروج حاصل کیا۔

عہد تیمور میں سرزمین کشمیر پر بہت عمدہ کاغذ تیار ہونے لگا۔ اور کتابوں کے شائقین کی آرزو بر آنے لگی۔ آج اس دور میں لاکھوں کتب، چھاپہ خانوں سے ہر روز چھپ رہی ہیں اور زبانِ حال سے قرآن شریف کی ایک زبردست پیشگوئی وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ کی صداقت کا اظہار کر رہی ہیں۔ مسلمانوں کے جمالیاتی ذوق نے کاغذ سازی

کے ساتھ ساتھ اگر ایک طرف کتابت میں حسن و زیبائش کو راہ دکھائی تو دوسری طرف فنِ کتابت کو خطاطی کی حدود سے نکال کر نقاشی کی قلمرو میں داخل کر دیا۔

عبدالرحیم خانخاناں کے دور میں ہمارے اس ہمدم کے ظاہری حسن و جمال پر بہت توجہ دی گئی۔ وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم میں مسلمان جلد سازوں کے سونے چاندی سے ملمع کی ہوئی جلدیں اب بھی لائبریریوں کا حسن دوبالا کر رہی ہیں۔ اور مسلمانوں کے "عشق کتاب" کی زبانِ حال سے معترف ہیں۔ اس ضمن میں حضرت ابن عربیؒ کی ایک باغ و بہار تحریر ملاحظہ ہو جو آپ کی کتاب سے والہانہ محبت کی عکاسی کرتی ہے

آپ فرماتے ہیں:-

"میرے نزدیک کتاب ہی ایک ایسا پھلوں کا باغ ہے جو آستین میں رکھا جا سکتا ہے۔ اور وہی ایک ایسی سرسبز سیرگاہ ہے جو انسان کے ساتھ جہاں وہ چاہے جا سکتی ہے۔ کتاب مُردوں کی زبان اور زندوں کی آواز ہے۔ وہ شام کے وقت آپ سے ملنے والا ایک ایسا دوست ہے جو اس وقت تک نہیں سوتا جب تک آپ خود نہ سو جائیں اور ہمیشہ وہی بات کرتا ہے جس سے آپ کو خوشی ہوتی ہے۔ کبھی آپ کا راز فاش اور

امانت میں خیانت نہیں کرتا۔ وہ انتہائی درجہ کا وفادار ہمسایہ، معقول دوست، فرمانبردار ساتھی، منکسر المزاج استاد اور ماہر و مفید انیس ہے جو کبھی کسی معاملے میں بحث کرتا ہے نہ ہی اپنے مالک سے اکتاتا ہے۔"

(محاضرات ابن عربیؒ)

مسلمانوں نے قرآنی تعلیم کی روشنی میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ۔ پر عمل کرتے ہوئے علم کے حصول اور اس کی ترویج کے لئے انتہائی شغف اور لگن کا مظاہرہ کیا۔ جس کے نتیجہ میں بہت جلد ان کے علوم کی دھوم تمام دنیا میں پھیل گئی۔ اور ان کے فنون کی دھاک ساری زمین پر بیٹھ گئی۔ جسے سن کر اپنے تو اپنے غیر بھی مدح سرائی کرنے لگے۔ چنانچہ امریکی مصنف مسٹر ڈریپر نے اپنی کتاب "معرکۂ مذہب اور سائنس" میں مسلمانوں کے علمی ذوق و شوق سے متعلق لکھا :-

"یہ اعلیٰ درجہ کا علمی مذاق اس زمانہ میں بھی قائم رہا جب عربی سلطنت تین جداگانہ سلطنتوں میں تقسیم ہو چکی تھی ...... یہ لوگ

ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تو تھے ہی لیکن علم و حکمت اور ادب و انشا کی سرپرستی میں بھی ہر ایک کی کوشش تھی کہ دوسروں پر فوق لے جائے "۔

مشہور مؤرخ گبن نے اعتراف کیا کہ "صوبوں کے خود مختار امیر بھی علم و ہنر کی سرپرستی میں شاہانہ اقتدارات برتتے تھے۔ اور اُن کے رقیبانہ جوشِ مسابقت نے علمی مذاق کی ترویج میں غیر معمولی حصہ لے کر سائنس کے نور کو سمرقند اور بخارا سے فارس اور قرطبہ تک پھیلا دیا"۔

علامہ لبنان نے "تمدن عرب" میں شہادت دی کہ "یورپ کی یونیورسٹیاں چھ سو برس تک عربی کتابوں کے تراجم پر زندہ رہیں۔ وہ عرب ہی ہیں جنہوں نے یورپ کو علم، اخلاق اور تہذیب کی راہیں دکھلائیں۔ عرب تہذیب بلاشبہ تاریخ انسانی کا محیر العقول معجزہ ہے"۔

اور ایچ جی ویلز نے لکھا:۔

"اسلامی تمدن مغربی تمدن کا پیش رو ہے۔ بصرے، کوفے، بغداد، قاہرہ قرطبہ کی یونیورسٹیاں علم و حکمت کا مرکز تھیں اور تمام جہان میں نور پھیلا رہی تھیں۔ یورپ میں عربی فلسفہ سپین کی راہ سے داخل ہوا اور پیرس، آکسفورڈ اور شمالی اٹلی کی یونیورسٹیوں پہ چھا گیا۔ اس عربی فلسفے نے یوروپین ذہن کی

بقیہ دنیا میزائلوں کی

(از صفحہ ۲۷)

سے لیس چھ اسکواڈرن ہیں جن کے پاس چون میزائل ہیں۔

ٹائٹن ۲ کے اڈے ڈیوس مانتھن، ایری زونا، میک کانل، کنساس اور ارکنساس میں واقع ہیں۔ اس میزائل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ بلاسٹک شکن میزائل اس کا سراغ لگانے یا اسے تباہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

کایا پلٹ دی۔ طب میں مسلمانوں نے جو ترقی کی یونان اس کے پاسنگ بھی نہیں پہنچا۔"

ہم اپنے اسلاف کے حیرت انگیز علمی کارناموں پر فخر کرتے ہیں تو بجا کرتے ہیں مگر کیا بات ہے کہ آج وہ رُوح رواں ہم میں نہیں۔ وہ خون جس میں مسابقت کی رُوح تھی آج احساس کمتری سے منجمد ہُوا جا رہا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب ایک انگریز مؤرخ کی قلم سے دیتا ہوں۔ اولڈ کے جس نے سورۃ الفاتحہ پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے، وہ لکھتا ہے :۔

"اہلِ اسلام کو جو دُعا خدا تعالیٰ نے سکھائی ہے۔ ایسی جامع دُعا کسی مذہب میں موجود نہیں۔ اگر اہلِ اسلام اپنی کتاب پر غور و خوض کرتے تو آج اہلِ یورپ کی بجائے وہ ہر چیز کے موجد۔ ہر فن کے ماہر، اور علم کے سرتاج ہوتے۔"

دُعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں علم کی محبت سے بہرہ ور کرے اور ہم سستی تفریحوں کی بجائے کتاب کی دُنیا میں کھو کر علوم ظاہری اور باطنی سے شاد کام ہوں۔ آمین۔

طنز و مزاح

ہم نے ایڈیٹری کی

مرسلہ: محمد اشرف نوشاہی

ہماری کرم فرمائیوں سے تنگ آکر ایک دن حضرت اُول جُلول نے جو کہ ہمارے پسندیدہ رسالے چٹاخ پٹاخ کے مدیرِ نامدار تھے اپنی کرسیٔ ادارت ہمارے حوالے کرتے ہوئے اور فرمایا لو میاں! اب پورے ایک ماہ تمہیں ماہنامہ چٹاخ پٹاخ کا کاروبار نمٹانا ہے ہم تو چلے وادیٔ سوات کی سیر کو — ہم نے ہزار منت سماجت کی کہ حضرت معاف کر دیجئے۔ اگر کوئی خطا ہو گئی ہو انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا مگر انہوں نے ایک نہ مانی اور ہمیں ایڈیٹر بنا کر خود سفر کو سدھارے اب گلے پڑا ڈھول تو بجانا ہی تھا۔ لہٰذا ہم نے نئے شمارے کی تیاری شروع کر دی۔ مضامین کی فائل دیکھی تو ایک بھی مضمون پسند نہ آیا۔ دراصل ماہنامہ چٹاخ پٹاخ ادبی نوعیت کا رسالہ تھا اور ہم اگر باادب ہوتے تو گھر آنے والے مہمان ہم سے نالاں کیوں رہتے۔ اسی لئے ادب سے بھرپور یہ مضامین ہمارے سر پر سے یوں گذر گئے جیسے کسی چھوٹے سے جزیرے پر سے ہیلی کاپٹر مگر کچھ تو کرنا تھا ورنہ رسالے کے مالک بنگڑ بگڑاوی ہماری چٹنی بنا دیتے۔ خیر ہم نے قلم سنبھالا اور دھڑا دھڑ مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ ہمیں ایڈیٹروں سے گلہ بھی تھا کہ ہمارے مضمون کیوں نہیں چھاپتے۔ اب سنہری موقع تھا۔ لہٰذا خوب ہاتھ رنگے بہت سے مضامین خود لکھے اور کچھ مضامین میں اپنے قلم سے یوں اصلاح کر دی کہ بقول ہمارے وہ ادب کے شہکار بن چکے تھے۔ مضامین کے بعد باقی امور نمٹائے اور یوں رسالہ وقت سے چند دن پہلے بازار میں آگیا۔

سرورق میں بھی ہم نے بنیادی تبدیلیاں کی تھیں اور اپنے ہاتھ سے ایک تجریدی شہکار بنا کر رسالہ کو زینت بخشی تھی۔ اُمید تھی کہ رسالہ دھڑا دھڑ بکے گا۔ اور ہر جانب سے واہ واہ ہو گی۔ سالانہ خریداروں کو ڈاک سے بھجوا دیا۔ بک اسٹالوں پر بھی پہنچا دیا گیا۔ اور بے تابی سے مزید بھجوانے کی فرمائش کا انتظار شروع کر دیا۔

ایک دن ہم حسبِ معمول اپنے دفتر میں بیٹھے انتظار میں مصروف مکھیاں مار رہے تھے کہ ایک دھماکے کے ساتھ ایک صاحب داخل ہوئے

یہ ہمارے رسالے کے مستقل لکھنے والے تھے۔ آدمی معقول تھے مگر آج نجانے کیوں نتھنے پھلائے ہوئے تھے آتے ہی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور گرج کر بولے آپ کو کس نے ایڈیٹر بنایا ہے ؟"

"جی حضرت اول جلول نے" ہم نے نیاز مندی کے ساتھ کہا۔

"کاؤ دی ہے وہ بھی اور آتم بھی" — وہ واقعی بہت گرم تھے۔

آخر ایسی کیا بات ہوگئی کہ آپ خفا ہیں؟ ہم نے اپنے وقار کو ملحوظ رکھ کر کہا۔

یہ دیکھئے — انہوں نے نیا شمارہ ہمارے سامنے پٹخ دیا۔ آپ نے کس طرح میرے مضمون کا ستیاناس کیا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے ایک عبارت ہمارے سامنے کر دی لکھا تھا —

"اس نے کینو کے چھلکے زمین پر پھینکنے کی
بجائے کوڑے کرکٹ کے ڈبے میں ڈال
دیئے اور خود بس کے انتظار میں قطار
میں لگ گیا"

"کس نے کہا تھا ایسی اصلاح کو۔ کبھی کسی ہیرو کو بھی یوں معاشرتی اصولوں کا پابند دیکھا ہے آپ نے؟" وہ گرجے

ن — ن — نہیں — ہم گھگھیا ئے۔

تو بس اب ہماری آپ کی ختم۔ آئندہ مجھے تنگ مت کیجئے گا! — یہ کہہ کر وہ جلال میں اٹھے اور باہر چلے گئے۔ اور ہم ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگے۔

چند لمحے عافیت کے گزرے تھے کہ ہم نے حضرت تشنہ کو تشریف لاتے دیکھا اُن کی کیفیت بھی گرم مسالے کی سی تھی۔ سلام نہ دعا آتے ہی ہمارا گریبان پکڑ کر ارشاد فرمایا ارے فکر و سخن کے دشمن کس نے تجھے ایڈیٹر بنا دیا ہے ؟۔

ہم نے بمشکل تمام گریبان چھڑوایا اور انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر وہ کہاں مانتے ہم نے اُن کی اچھی خاصی غزل کا حلیہ یوں بگاڑا تھا کہ اب وہ آزاد نظم بھی نہ رہی تھی۔ ہماری لاکھ معذرتیں بھی اُن کو رام نہ کر سکیں اور وہ بھی ماہنامہ چٹاخ پٹاخ سے تعلق چھوڑ کر سدھار گئے اور اس کے بعد تو یکے بعد دیگرے نجانے کون کون ہم پر ستم توڑنے آیا۔ بک اسٹالوں سے ساری کی ساری کاپیاں واپس آگئیں اور ہمیں صدمے پر صدمہ پہنچا۔ اور بالآخر سیٹھ ہنگڑ بگڑالوی نے بنفسِ نفیس تشریف لا کر ہمیں گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ دو چار جھٹکے دے کر لباس تار تار کر دیا اور گالیوں کے تمغے عنایت فرماتے ہوئے دفتر سے باہر کیا۔ جب ہم باہر گرے تو چٹاخ پٹاخ کا تازہ شمارہ جسے کو نہ جانے کن کن اُمنگوں کے ساتھ ترتیب دیا تھا ہمارے ہاتھوں میں تھا اور اُسے دیکھ کر بے اختیار ہمارے لبوں پر یہ شعر آگیا۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

معلومات

دنیا میزائلوں کی

(جناب اسمٰعیل مبارک اسمر راولپنڈی چھاؤنی)

میزائلوں کی آئندہ جنگ کس قدر خوفناک ہو گی۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بنی نوع انسان اپنے ہی ہاتھوں تباہی و بربادی کے جو سامان کر رہا ہے اس کی ایک جھلک ذیل میں پیش ہے۔

منٹ مین

تین حصّوں پر مشتمل یہ بین البر اعظمی میزائل، بوئنگ کمپنی کی ایجاد ہے۔ لمبائی اٹھاون فٹ دس انچ، وزن چھہتر ہزار پونڈ، رفتار کی حد پندرہ ہزار میل فی گھنٹہ اور مار کی حد آٹھ ہزار میل سے زائد اور وار ہیڈ تھرمو نیوکلیر یا ایم آئی آر وی کارٹیاں۔

منٹ مین، بین البر اعظمی میزائلوں کی پہلی نسل ـــ ٹائٹن اور اٹلس سے سبقت لے جانے کے لئے ایجاد ہوا۔ یہ زیر زمین اڈوں پر پلک جھپکنے میں حملہ کیلئے تیار رہتا ہے اگرچہ یہ پہلی نسل کے میزائلوں سے جسامت اور وزن میں کم ہے۔ تاہم اس کی مار کی حد ان کے برابر ہے۔ وار ہیڈ بھی نسبتاً چھوٹا ہے لیکن ایم آئی آر وی کے استعمال سے یہ دشمن کے دفاعی حلقے میں آسانی سے گھس جاتا ہے۔

امریکہ میں اس میزائل سے پانچ ونگ مسلح کئے گئے ہیں۔ صرف پہلے ونگ میں دو سو زیر زمین اڈے ہیں۔ جو اٹھارہ سو میل کے علاقے میں پھیلے ہیں۔ ہر اڈا اسی فٹ گہرا ہے۔ سٹریٹجک ائیر کمانڈ کے دو افسر زیر زمین لانچ سنٹر سے دس میزائلوں کی پرواز کو کنٹرول کرتے ہیں۔

سپارٹن

یہ بلسٹک شکن میزائل طویل فاصلے پر مار کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔ اسے ویسٹرن الیکٹرک کمپنی نے تیار کیا۔ اس کا وار ہیڈ ایٹمی اور لمبائی

پچپن فٹ ہے۔ وزن اور صلاحیتِ کار کی تفصیلات صحیح طور پر منظر عام نہیں آسکی ہیں۔ یہ بلسٹک شکن امریکی دفاعی نظام کا ایک حصہ ہے جس میں سپرنٹ نامی میزائل بھی شامل ہے۔ سپارٹن کی مؤثر کارکردگی کا ثبوت ۲۸ اگست ۱۹۷۰ء کو ملا۔ جب اس نے چار ہزار دو سو میل دور سے چھوڑے جانے والے "منٹ مین" بین البر اعظمی بلسٹک میزائل کو سو میل کی بلندی پر جالیا۔ اسی طرح ۲۳ دسمبر ۱۹۷۰ء کو سپرنٹ کی آزمائش کی گئی۔ دونوں کا نشانہ ایک جیسا تھا۔ یہ میزائل مکمل طور پر خود کار نظام سے آراستہ ہے اس کا ایٹمی وارہیڈ عین اسی وقت چھوٹتا ہے جب سو فیصد امید ہو کہ حملہ آور بلسٹک میزائل اس کی زد میں ہے اور فضا سے اوپر ہی اسے تباہ کر سکتا ہے۔ امریکہ میں "سیف گارڈ" کے نام سے مختلف دفاعی اڈے بنائے گئے ہیں۔ جہاں سپارٹن اور سپرنٹ نصب ہیں۔ اور یہ بین البراعظمی میزائلوں کے حملے کی صورت میں فضا میں بلند ہو کر دفاع کریں گے۔

ماسکیٹو

سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی افواج میں عام طور پر مستعمل یہ ہلکا طیارہ شکن میزائل تین فٹ سات انچ لمبا، اکتیس پونڈ وزنی، دو سو پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بارہ سو سے آٹھ ہزار فٹ کے فاصلے تک مؤثر ہوتا ہے۔ اسے پیدل فوج کا صرف ایک آدمی فائر کر سکتا ہے۔ ہیلی کاپٹر یا ہلکی گاڑی سے بھی اسے نشانے پر پھینک سکتے ہیں۔

گلوش

اس میزائل پر اس وقت تک کام ہوتا رہا جب تک اس کے مد مقابل امریکی سیف گارڈ نظام پر تحقیقات جاری رہیں۔ گلوش جس ڈھانچے میں بند ہوتا ہے۔ اس کا پہلی بار مظاہرہ ۷ نومبر ۱۹۶۴ء کو ماسکو پریڈ میں کیا گیا۔ اس موقعہ پر روسی کمنٹیٹر نے اسے بلسٹک شکن میزائل قرار دیا۔ امریکی افسروں کے بیانات سے پتہ چلا ہے کہ صرف ماسکو شہر کے اردگرد اس میزائل کے چونسٹھ اڈے ہیں جہاں خطرے سے بہت پہلے خبردار کرنے کیلئے راڈار کی سہولت بھی مہیا ہے۔ ایک راڈار سٹیشن تو فٹ بال کی تین گراؤنڈوں کے رقبے پر حاوی ہے۔

سکارپ

یہ روس کا بین البراعظمی بلسٹک میزائل ہے۔ ایک سو تیرہ فٹ چھ انچ لمبا اور گولائی دس فٹ مار کی حد زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ ہزار میل ہے۔ اس کے ساتھ تین متبادل وارہیڈ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ایک بیس سے پچیس

میگاٹن تھرمونیوکلیر، دوسرا پانچ پانچ میگاٹن کی تین ایم آئی آروی گاڑیاں اور تیسرا خلائی بم۔ اس مضمون میں بیان کردہ تمام میزائلوں میں سکارپ سب سے زیادہ تباہ کن میزائل ہے۔ اسے کمیونسٹ انقلاب کی پچاسویں سالگرہ پر ۷ نومبر ۱۹۶۷ء کو ماسکو کی پریڈ میں نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔ چار روز پہلے امریکی وزیر دفاع نے اعلان کیا تھا کہ روس کے پاس "خلائی بم" موجود ہے جس کا تجربہ ۲۵ جنوری ۱۹۶۷ء کو کاسموس ۱۳۹ خلائی جہاز کے لبادے میں کیا گیا۔ بعد کے تجربات کے دوران یہ "خلائی بم" امریکی رسد گاہوں نے دیکھ بھی لیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوا کہ سکارپ کا راکٹ سو میل کی بلندی پر اپنا تھرمونیوکلیر بم علیحدہ کر دیتا ہے۔ زمین کے مدار میں پہلا چکر لگانے کے بعد اس کی رفتار سست ہو جاتی ہے اور یہ عین نشانے پر گر جاتا ہے

سٹائکس

یہ وہ شہرہ آفاق میزائل ہے جس نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیلی جنگ میں ۲۱ اکتوبر کو اسرائیلی تباہ کن جہاز ایلات کو سمندر کی گہرائیوں میں غرق کر دیا۔ موت اور تباہی اس جہاز کو پورٹ سعید سے پندرہ میل کے فاصلے پر آئی تھی چنانچہ روس کی بنی ہوئی اوسا کشتی کشتیوں سے مصری بحریہ کے جوانوں نے ایلات پر سٹائکس میزائلوں کی بارش کر دی۔ اور اسے اتھاہ پانی میں جا لیا۔ یہ روسی میزائل بحری جہاز سے زمین پر مار کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اور اسے راڈار ہومنگ سسٹم کے تحت کنٹرول کیا جاتا ہے۔ لمبائی اکیس فٹ، مار کی حد اٹھتیس میل، پروں کی چوڑائی آٹھ فٹ دس انچ اور وارہیڈ میں دھماکہ خیز بارود، جہاز سے جہاز پر نشانہ بنانے کیلئے اسے فوقیت حاصل ہے۔ اوسا قسم کی کشتیوں میں چار سٹائکس میزائل نصب ہوتے ہیں۔ اور کومار کشتیوں میں صرف دو۔ روسی بحریہ کے پاس اس قسم کے ایک سو پچیس جہاز ہیں۔ الجزائر چین۔ کیوبا۔ مصر۔ مشرقی جرمنی۔ انڈونیشیا۔ پولینڈ۔ رومانیہ شام اور یوگوسلاویہ کی بحری فوجیں بھی اس سے لیس ہیں۔

سارجنٹ

یہ زمین سے زمین پر مار کرنے والا میڈیم رینج کا آرٹلری میزائل ہے۔ اس کا وارہیڈ ایٹمی یا دھماکہ خیز بارود کا ہو سکتا ہے۔ لمبائی ۳۴ فٹ، وزن دس ہزار ایک سو پونڈ اور مار کرنے کی حد اٹھائیس سے پچاسی میل۔ یہ توپ خانے کی بٹالینوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس سے پہلے امریکہ میں جتنے آرٹلری میزائل تھے یہ ان سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ۱۹۶۲ء میں اس کی تیاری شروع ہوئی اور

پانچ سو کے قریب میزائل امریکی یونٹوں کے پاس موجود ہیں۔ ایک سو میزائل مغربی جرمنی کی فوج نے حاصل کئے۔ سارجنٹ میزائل کو ہوائی جہاز کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔ چھ آدمیوں کا عملہ اسے چند منٹ میں چلا سکتا ہے۔ ایک سارجنٹ بیٹری میں صرف ایک ٹرک اور تین ٹریلر شامل ہوتے ہیں۔

بلڈ ہاؤنڈ

زمین سے فضا میں مار کرنے والا یہ برطانوی میزائل کم بلندی پر تیز رفتار طیاروں کے خلاف انتہائی کارگر ہتھیار ہے۔ ستائیس فٹ نو انچ لمبا ہے۔ وار ہیڈ میں دھماکہ خیز بارود استعمال کیا گیا ہے۔ طیاروں کے ذریعے کسی دوسرے مقام پر منتقل ہونے کی صلاحیت اس قدر ہے کہ برطانوی فضائیہ نے ۱۹۶۴ء میں اسے ملائشیا پہنچا دیا۔ جب یہ علاقہ چھوڑنا پڑا تو سنگاپور ائیر ڈیفنس کمانڈ نے انہیں کنٹرول میں لے لیا۔ سویڈن اور سوئٹزرلینڈ نے بھی بلڈ ہاؤنڈ خرید رکھے ہیں۔ اس میزائل کی مار کی حد پچاس میل سے زائد ہے۔

بلو پائپ

یہ میزائل کندھے سے فائر کیا جاتا ہے۔ اور قریبی فاصلے کیلئے مؤثر ہے۔ زمین سے فضا میں مار کرتا ہے۔ لمبائی ساڑھے چار فٹ، وزن چالیس پونڈ وار ہیڈ میں دھماکہ خیز بارود اور انفرا ریڈ شعاعیں شامل ہوتی ہیں۔ اسے برطانیہ کی فرم سٹارٹ برادرز اینڈ ہارلینڈ نے تیار کیا ہے۔ بلو پائپ اس قدر چھوٹا ہے کہ چھاتہ بردار بھی اسے اٹھا سکتا ہے۔ اس کے فائر کا طریقہ بھی بالکل آسان ہے۔ اسی لئے برطانوی فوج اور بحریہ میں مقبول ہے۔

میلان

فرانس اور جرمنی کی مشترکہ کاوشوں کے نتیجے میں معرض وجود میں آنے والا یہ ہتھیار، پیادہ فوج ٹینکوں کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ لمبائی دو فٹ ساڑھے پانچ انچ، وزن قریباً چودہ پونڈ رفتار چار سو میل فی گھنٹہ اور مار کی حد چھ ہزار سے آٹھ ہزار فٹ تک ہے۔ ایک آدمی اس کے ضروری آلات اٹھا سکتا ہے دوسرا آدمی فالتو میزائل اپنے پاس رکھتا ہے۔ کم فاصلے کیلئے اسے مؤثر طور پر ریکائیلیس رائفل کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا ہے یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ کم بلندی پر اڑنے والے ہیلی کاپٹر یا ہوائی جہاز کے خلاف بھی یہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔

ھاک

قریبی فاصلے کیلئے یہ مشہور امریکی میزائل زمین

سے فضا میں مار کرتے ہیں۔ یورپ اور جاپان میں بھی یہ ہزاروں کی تعداد میں تیار کئے گئے طیارہ شکن ہتھیاروں کی حیثیت سے یہ انتہائی مشکل کام سرانجام دیتا ہے۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں ایک ہاک میزائل نے "آنسٹ جان سپر سانک آرٹلری راکٹ" کو راستے میں جالیا اور تباہ کر دیا۔ اس طرح یہ پہلا میزائل تھا جس نے بلسٹک میزائل مار گرایا۔ اگست ۱۹۶۰ء کے بعد انہیں فوج میں تقسیم کیا گیا۔ امریکہ کے علاوہ دوسرے ممالک جنہوں نے یہ میزائل حاصل کئے ہیں۔ اُن میں بیلجیم۔ فرانس۔ اسرائیل۔ اٹلی۔ جاپان۔ کوریا۔ پاکستان۔ نیدرلینڈ۔ سعودی عرب۔ اسپین۔ سویڈن۔ تائیوان اور مغربی جرمنی شامل ہیں۔ ہاک میزائل کا مکمل نظام ہیلی کاپٹر یا پروں والے طیارے کے ذریعے کسی بھی جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے ایک بیٹری میں تین تین میزائلوں کے چھ لانچر ہوتے ہیں۔ ایک گاڑی جو ایک وقت میں تین میزائل لوڈ کر لیتی ہے۔ چار رڈار اور ایک بیٹری کنٹرول سنٹر۔ ہاک میزائل درختوں کی بلندی تک بھی انتہائی مؤثر ہتھیار ہے۔

کوبرا

جرمنی کا بنا ہوا یہ ہلکا ٹینک شکن میزائل پاک فوج کے زیر استعمال ہے۔ اسے صرف ایک شخص چلا سکتا ہے۔ اس کی لمبائی تین فٹ ڈیڑھ انچ، وزن ساڑھے بائیس پونڈ، رفتار ایک سو نوّے میل فی گھنٹہ اور مار کی حد تیرہ سو فٹ سے ساڑھے چھ ہزار فٹ تک ہے۔ اس ہتھیار کے نظام میں کوبرا میزائل، کنٹرول بکس اور تاروں کا رابطہ شامل ہے۔ صرف ایک کنٹرول بکس سے آٹھ میزائل چلائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے لانچر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ یہ زمین پر ہی رکھا جاتا ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار سے زیادہ کوبرا میزائل ڈنمارک۔ جرمنی۔ اٹلی۔ پاکستان اور ترکی کے ہاتھوں فروخت ہو چکے ہیں۔

ٹائٹن :- یہ بین البرّاعظمی بلسٹک میزائل، مارٹن کارپوریشن کا تیار کردہ ہے۔ لمبائی ایک سو تین فٹ، وزن تین لاکھ بیس ہزار پونڈ، رفتار ستر ہزار میل فی گھنٹہ اور زیادہ سے زیادہ مار چھ ہزار تین سو میل۔ یہ تھرمونیوکلیر دار ہیڈ سے لیس ہوتا ہے سلنڈر کی شکل کا یہ خوفناک ترین میزائل دو مرحلوں پر مشتمل ہے جسے الیکٹرانس کی مدد سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ امریکی ایئر فورس کی اسٹریٹیجک ایئر کمانڈ نے شروع میں اٹلس اور ٹائٹن کے نام سے دیو ہیکل بین البرّاعظمی میزائل ایجاد کئے ۱۹۶۳ء میں ٹائٹن ۲ بھی اس برادری میں شامل ہو گیا۔ یہ طویل فاصلے پر مار کرنے والے ابتدائی میزائلوں میں انتہائی تباہ کن ہتھیار ہے۔ اسے زیر زمین اڈوں پر ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ اور چلایا بھی جا سکتا ہے۔ آج تک امریکہ میں جتنے بھی ہائیڈروجن بم بردار میزائل ہیں۔ اُن کے مقابلے میں اس کے وارہیڈ میں سب سے بڑا ہائیڈروجن بم لگایا گیا ہے۔ اسی لئے امریکی فضائیہ میں اس میزائل

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

Monthly KHALID Rabwah

September 1980 *Editor* : **Mohammad Ilyas Munir** **Regd. No. L5830**

صرف ٹائٹل نصرت آرٹ پریس ربوہ میں چھپا ۔